اترپردیش اردو اکادمی
उत्तर प्रदेश उर्दू अकादमी

خبرنامہ

ماہنامہ — اُترپردیش اُردو اکادمی — لکھنؤ

اپریل ۲۰۲۴ء

اردو اکادمی آڈیٹوریم میں ۷؍مارچ ۲۰۲۴ء کو منعقدہ ریسرچ اسکالرس سیمنار میں (دائیں سے) پروفیسر شہاب الدین ثاقبؔ، ڈاکٹر صبیحہ انور، پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ، ایس۔ مناظر عادل حسن سکریٹری اردو اکادمی اور ڈاکٹر ریشماں پروین

حمیدیہ گرلز ڈگری کالج پریاگ راج میں ۲۹ رفروری ۲۰۲۴ءکو ثقافتی جلسہ میں جناب عادل حسن،
سکریٹری اردو اکادمی کی خدمت میں مومنٹو پیش کرتے ہوئے کالج کی پرنسپل ڈاکٹر ناصحہ عثمانی

حمیدیہ گرلز ڈگری کالج پریاگ راج میں ۲۹ رفروری ۲۰۲۴ءکو منعقدہ گنگا جمنی تمثیلی مشاعرہ کا دلکش منظر

اتر پردیش اردو اکادمی

خبرنامہ

جلد : ۵۲ اپریل ۲۰۲۴ء شمارہ : ۱۰

ایڈیٹر : ایس۔مناظر عادل حسن (سکریٹری)

معاون : محمد معاذ اختر احسن (سپرنٹنڈنٹ)

زر سالانہ : پچاس روپے -/50

قیمت فی شمارہ : پانچ روپے -/5

upurduakademi3@gmail.com

www.upurduakademi.in

خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ

سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ،

گومتی نگر، لکھنؤ-226010

فون نمبر:0522-4022924

ایس۔مناظر عادل حسن، سکریٹری، ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر نے امپریشن پرنٹ ہاؤس، لاٹوش روڈ لکھنؤ سے چھپوا کر دفتر اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ سے شائع کیا۔

ترتیب

اداریہ	ایڈیٹر	۲
اردو افسانہ نئی صدی نئے موضوعات	ڈاکٹر ریاض توحیدی	۳
غزل	نازؔ پرتاپ گڑھی	۸
غزل	جمیل احمد جمیلؔ	۸
میں زندہ زبان ہوں!	ڈاکٹر محمد مستمر	۹
غزل	طلحہ تابشؔ	۱۲
غزل	غلام مصطفٰی فرازؔ	۱۲
مجنوںؔ گورکھپوری اور اردو افسانے	احتشام افسر	۱۳
غزل	ڈاکٹر نیازؔ سلطانپوری	۱۶
غزل	عمر شریفؔ مہوی	۱۶
دُور اندیشی	ریحان عباس	۱۷
ساڑھے آٹھ جملے	ڈاکٹر مشتاق احمد وانی	۲۵
غزل	دردؔ فیض خان	۲۷
تبصرہ	مبصر	...
بیانِ شبلی (حصہ سوم) مصنف ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	پروفیسر ثوبان سعید	۲۸
اردو اکادمی میں سیمنار (خبر)	ادارہ	۳۱
حمیدیہ کالج میں ثقافتی جلسہ	ادارہ	۳۲

●●●

اداریہ

اترپردیش اردو اکادمی نے اردو صحافت کے ۲۰۰ برس مکمل ہونے پر گذشتہ برس ایک عظیم الشان سیمنار منعقد کیا تھا جس میں ملک کے مختلف علاقوں سے صحافیوں اور یونیورسٹیوں کے پروفیسران کو مدعو کیا گیا اور بڑے معیاری مقالے پڑھے گئے تھے۔

اسی نوعیت کا ایک دوسرا بڑا سیمنار ۷؍مارچ ۲۰۲۴ء کو منعقد کیا گیا۔ اس سیمنار کا مقصد صرف یہی تھا کہ اردو میں تحقیق کرنے والے ریسرچ اسکالر اپنے موضوع سے متعلق مقالہ پیش کریں تاکہ ان کی صلاحیت نیز اردو میں نئے نئے موضوعات پر ہونے والے تحقیقی کام سے متعلق اہل اردو کو علم ہو سکے اور ریسرچ اسکالرس کی حوصلہ افزائی ہو۔ اس سیمنار کی صدارت ماہرلسانیات پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر شہاب الدین ثاقب اور مہمان ذی وقار کے طور پر مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر صبیحہ انور شریک ہوئیں۔ اترپردیش کی یونیورسٹیوں کے شعبۂ اردو سے وابستہ ریسرچ اسکالرس نے اپنے مقالے پیش کئے۔

سماجی حسیت کا علمبردار غضنفر، آزادی کے بعد جدید نظم میں زبان کا تحقیقی استعمال، جدید افسانوں میں صنعتی ترقی کے منفی اثرات، اترپردیش میں نعت گوئی کی روایت، ملک زادہ منظور احمد: ادیب و ناقد، اردو میں انشائیہ نگاری کی روایت، اختر الایمان کی نظم نگاری کا فکری مطالعہ، شمیم حنفی بحیثیت محقق و ناقد ایک مطالعہ، شمیم حنفی کی ادبی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی کی علمی وادبی خدمات کا جائزہ، رام نرائن اگروال کی خدمات، تقسیم ہند کا المیہ اور اردو انگریزی ناول ایک تقابلی مطالعہ، جیسے اہم موضوعات پر مقالے پڑھے گئے۔ صدر سیمنار، مہمان خصوصی و مہمان ذی وقار وغیرہ نے ان پڑھے گئے مقالوں پر اظہار خیال کیا۔ ساتھ ہی ریسرچ اسکالرس کو تحقیق سے متعلق بہت ساری وہ باتیں بتائیں جن کا علم ہر ریسرچ اسکالر کے لیے بہت ضروری ہے۔ پیش کردہ مقالوں کے موضوعات میں کچھ موضوع اہمیت کے حامل تھے یعنی واقعی ان موضوعات پر کام بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔

اب جس بات پر مجھے زور دینا ہے وہ یہ کہ اردو زبان اپنے لب ولہجہ سے پہچانی جاتی ہے کہنے کا مطلب یہ کہ اردو میں تلفظ کی بڑی اہمیت ہے۔ اس سیمنار میں کچھ ایسے بھی ریسرچ اسکالرس نے مقالے پڑھے جن کا تلفظ بھی درست نہیں تھا۔ سپروائزر صاحبان سے یہ امید کی جاتی ہے کہ رجسٹریشن کرتے وقت اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ اسکالرس کا تلفظ درست ہو۔ مستقبل قریب میں یہی اردو طالب علموں کے استاد بنیں گے۔ ان طالب علموں کو وہ کیا سکھائیں گے جن کا اپنا خود کا تلفظ درست نہیں ہے۔

ایس۔ مناظر عادل حسن

ایڈیٹر

ڈاکٹر ریاض توحیدی
وادی پورہ، ہنڈوارہ، کشمیر-Mob.9906834877

اردو افسانہ: نئی صدی، نئے موضوعات

اردو افسانہ ایک صدی سے زائد عرصے کا ارتقائی سفر طے کرتے ہوئے اب اپنی ادبی شناخت اتنی مستحکم کر چکا ہے کہ غزل کی مقبولیت کے پہلو بہ پہلو افسانہ بھی اپنی مقبولیت کا ڈنکا بجا رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فنی سطح پر ناول کے مقابلے میں افسانہ بھی غزل کی طرح ایجاز و اختصار اور موضوعاتی رنگارنگی کو اپنے دامن میں سمیٹتے ہوئے قلیل قرأتی دورانیہ (Reading duration) کے اندر قاری کے جمالیاتی و ادبی ذوق کو محظوظ کرتا ہے اور آج کا باذوق قاری اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی مطالعۂ افسانہ میں محسوس کرتا ہے، جس کے پیش نظر صنف افسانہ کا تخلیقی و مطالعاتی گراف دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے۔ چونکہ افسانہ کسی بھی موضوع کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی فنی وسعت رکھتا ہے۔ جس کو دیکھ کر اب تنقیدی تناظر میں موضوعاتی سطح پر افسانے کی موضوعاتی درجہ بندی بھی کی جاتی ہے۔ مثلاً رومانی فکشن، مسٹری فکشن، ہارر فکشن، کورونائی فکشن، سائنسی فکشن، تاریخی فکشن، جاسوسی فکشن، نفسیاتی فکشن، اخلاقی فکشن، مزاحمتی فکشن، سماجی فکشن، ٹریجڈی فکشن، ایڈونچر فکشن، تھرلر فکشن، مزاحیہ فکشن، فینٹیسی فکشن وغیرہ۔

فنی اور تیکنکی طور بھی افسانے کی کئی قسمیں سامنے آ چکی ہیں، تاہم یہاں پر فی الوقت افسانے کی موضوعاتی وسعت پر ہی ارتکاز کرنا مناسب ہے۔ جس سے یہ بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ افسانے کی موضوعاتی جہات اتنی وسیع ہیں کہ افسانے کے ضمن میں جو روایتی تعریف کی جاتی تھی یعنی جھوٹی بات، من گھڑت قصہ وغیرہ یا زیادہ سے زیادہ رومانوی قصہ کہانی، وہ سب تعریفیں قابل رد ہو چکی ہیں۔ کیونکہ آج کا یا نئی صدی کا افسانہ کسی بھی خطہ یا ملک کی سیاسی و سماجی، معاشی و معاشرتی، تہذیبی و ثقافتی، نسلی و طبقاتی، ماحولیاتی و سائنسی، تعلیمی و تدریسی اور فکری و وجودی وغیرہ مسائل و موضوعات کا تخلیقی اظہاریہ بن چکا ہے۔ (ان افسانوں کو چھوڑ کر جن میں تخیل کی بنیاد پر کوئی مصنوعی قصہ یا رومانی کہانی پیش کی جاتی ہے۔) اور آج کا قاری دنیا کے کسی بھی علاقے یا خطے کے تعلق سے تخلیق شدہ افسانے کو پڑھ کر وہاں کے حالات و مسائل اور زندگی گزارنے کے رنگ ڈھنگ سے آگاہ ہو جاتا ہے اور وہ یہ نہیں سوچتا ہے کہ وہ کوئی من گھڑت قصہ پڑھ رہا ہے۔

کیونکہ آج کے بیشتر ادیب یا فکشن نگار اپنی تحریر یا فکشن میں

زمینی حقائق کو تخلیقی اسلوب میں پیش کرنے کا احساس رکھتے ہیں اور اس ذمہ داری کو سمجھتے ہیں کہ وہ بھی سماجی زندگی میں کوئی تعمیری رول نبھانے کی سعی کرتے ہیں۔اس طرح آج کا افسانہ حقیقت کا تخلیقی روپ بن گیا ہے۔

چونکہ پیش نظر مقالہ نئی صدی کے افسانوی موضوعات ومسائل پر تحریر ہوا ہے تو اس میں اردو افسانے کی روایت یا معروف ومشہور افسانہ نگاروں جیسے پریم چند، منٹو، منٹوعصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، پریم ناتھ پردیسی وغیرہ کی افسانہ نگاری کے برعکس نئی صدی کے افسانوں کی موضوعاتی جہات کا مختصر احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ نئی صدی کے موضوعات ومسائل کیا ہیں۔اس ضمن میں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ کئی مسائل ایسے ہیں جو ہر زمانے یا دور میں یکساں طور پر اپنی اہمیت برقرار رکھتے ہیں۔ جیسے غربت وافلاس، سماجی و معاشی استحصال، عائلی و تانیثی مسائل، طبقاتی ونسلی کشمکش وغیرہ۔ تاہم ہر دور کے اپنے کچھ مخصوص یا نئے موضوعات ومسائل بھی ہوتے ہیں۔اس لئے اکیسویں صدی کے افسانوی ادب میں دونوں قسم کے مسائل وموضوعات کی بھرپور تخلیقی عکاسی نظر آتی ہے۔اس کلیدی مقالے میں مقامی سطح سے لے کر عالمی سطح پر تخلیق شدہ اردو افسانے میں پیش ہوئے موضوعات ومسائل کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔جن میں تہذیبی وثقافتی، سیاسی وسماجی، وجودی وفکری، تانیثی وعائلی، جنگی ونفسیاتی، ہم جنس پرستی، تھرڈ جینڈر، سائبر کلچر، تجارتی و اقتصادی، نسلی و مذہبی، وبائی و ماحولیاتی، تعلیمی و تدریسی، سائنسی وسوشل میڈیائی وغیرہ موضوعات ومسائل شامل ہیں۔

نئی صدی کے اردو افسانے میں ان موضوعات ومسائل کو عمدہ ہنرمندی سے فکشن کا روپ دیا گیا ہے اور ان موضوعات و مسائل کو جن افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے ان میں سلام بن رزاق، رشید امجد، الیاس احمد گدی، سید محمد اشرف، نور شاہ، محمد حمید شاہد، شفیع مشہدی، عبدالصمد، طارق چھتاری، شموئل احمد، مشتاق مہدی، غضنفر علی، مشتاق نوری، ترنم ریاض، مشرف عالم ذوقی، وحشی سعید، دیپک بدکی، دیپک کنول، نگار عظیم، نورالحسنین، خالد جاوید، انور ظہیر رہبر، صادقہ نواب سحر، شاذ ملک، نعیمہ جعفری پاشا، اسلم جمشید پوری، بلند اقبال، نعیم بیگ، احمد صغیر، احمد رشید، فریدہ نثار انصاری، راجہ یوسف، رتن سنگھ، کنول پہلگامی، اور فریدہ تبسم کے علاوہ سید تحسین گیلانی، ذاکر فیضی، ریاض توحیدی، منیر احمد فردوس، نورالعین صحرا، طارق شبنم، فیض قاضی آبادی، نورالامین، ریحان کوثر، انور مرزا، تنویر تما پوری، ایوناش امن، ناصر ضمیر، صبا ممتاز بانو، عشرت ناہید، رافعہ ولی، حمیرا عالیہ، وسیم عقیل شاہ، مقصود دانش وغیرہ شامل ہیں۔ (اس کے علاوہ کئی اور نام بھی ہیں لیکن پھر تو صرف نام گنوانے تک ہی بات رہ جائے گی۔)

مذکورہ افسانہ نگاروں یا کئی اور افسانہ نگاروں کے افسانوں میں نئی صدی کے موضوعات کو اچھے ڈھنگ سے فکشنا ئز کیا گیا ہے۔

اب موضوع کے تعلق سے چند افسانوں پر بات کریں گے۔ اکیسوی صدی کے اہم موضوعات میں ۹/۱۱ کا واقعہ تاریخی نوعیت کا حامل ہے۔ یہ ایک ایسا تاریخی واقعہ ہے جس سے دنیا میں تہذیبی تصادم (Clash of civilization) کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور جو قومیں یا ممالک کل تک ایک دوسرے کے دوست تھے وہ ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔ اس واقعہ نے ادب پر بھی اپنے اثرات ڈالے اور دنیا کی کئی اور زبانوں کی طرح اردو فکشن پر بھی اپنے دوررس اثرات چھوڑے۔ اور کئی ناول اور افسانے اس واقعہ کے زیر اثر تخلیق ہوئے۔ مثلاً مسعود مفتی کے افسانے ''شناخت'' میں اس قسم کی خوفناک صورتحال کی عکاسی بخوبی کی گئی ہے۔ ایک اقتباس دیکھیں:

> ''حیرت اور تشویش نے ایک دم اس کے قدم جکڑ لیے۔ تھوڑے فاصلے پر ایک اونچے درخت کے موٹے تنے کے پیچھے مفیض مدافعانہ انداز میں سٹ کر کھڑا تھا اور درختوں سے ٹوٹی ہوئی شاخوں سے مسلح تین سفید فام امریکن لڑکے اسے جارحانہ انداز میں دھمکا اور ڈرا رہے تھے۔ غور سے دیکھا تو ان لڑکوں میں ایک جوزفین کا بانجھا بل (Bill) بھی تھا۔''

یہ تاریخی واقعہ تہذیبی تصادم کا جدید شاخسانہ بن گیا ہے اور اس قسم کا تصادم کئی اور ملکوں میں شروع ہوا جیسے ملکی سطح پر عصری تہذیبی و سیاسی صورت حال کا تخلیقی اظہار ریحان کوثر کے افسانے ''ریختہ'' میں نظر آتا ہے۔ جس میں اقلیت کے مستقبل کے سماجی و تہذیبی اور شناختی بحران (Socio - cultural identity crises) کو ترکی نژاد چین میں مقیم ایغور نسل کی حالت زار سے ملایا گیا ہے یعنی مستقبل میں کیا صورت حال بن سکتی ہے۔

اسی طرح اردو افسانے کے جدید موضوعات میں کورونا کا موضوع بھی شامل ہے۔ جن میں کورونا کی وجہ سے قیامت خیز ماحول کی کہانیاں اور واقعات پیش ہوئے ہیں۔ افسانہ ''لاک ڈاون'' (دیپک بدکی) میں کورونا کے حشر ساماں حالات کی کہانی پیش ہوئی ہے۔ افسانے کا کردار رام دھن مجبور ہوکر جب دہلی سے دیوی پور کا آٹھ سو کلومیٹر سفر سائیکل پر طے کر کے گھر پہنچتا ہے تو وہ اور اس کے گھر والے خوش ہوجاتے ہیں لیکن یہ خوشی بس چند لمحات کی ہوکر رہ جاتی ہے کیونکہ گھر کے اندر چارپائی پر بیٹھتے ہی اس کا جسم تھر تھر کانپنے لگتا ہے اور وہ زندگی کے آخری لمحات میں بیوی سے کہتا ہے:

> ''کچھ دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور کپکپاتی ہوئی آواز میں بیوی سے مخاطب ہوا۔ ''رُکمنی، شاید تمھارے ساتھ میرا سفر یہیں ختم ہو رہا ہے۔ تم صحیح سلامت گھر پہنچ گئی اس بات کا مجھے اطمینان ہے۔ دیکھو بچے کا خیال رکھنا۔'' اس کے ساتھ ہی رام دھن کی آواز ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی۔''

تھیوری کے پیش نظر، متن کے تخلیقی نظام (Creative nomenculture) کے متنی، معنوی، ساختیاتی اور اسلوبیاتی جہات کو تنقیدی مباحثہ بنانے کا طریقہ کار تفہیم کی راہیں استوار کرتا ہے۔ آج کل بیشتر افراد کے لئے آن لائن چیٹنگ ذہنی تفریح کرنے کا ایک آسان طریقہ

بن گیا ہے۔نوجوانوں میں یہ ایک وائرس کی طرح پھیل رہا ہے۔اس کے برے نتائج بھی سامنے آرہے ہیں۔معروف افسانہ نگار شموئل احمد کا افسانہ ''عنکبوت'' سوشل میڈیائی آن لائن چیٹنگ کے طریقہ کار اوراس کے منفی اثرات کو بخوبی موضوع بنا رہا ہے۔افسانہ پڑھ کر ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آن لائن چیٹنگ واقعی ایک ایسا تیکنو عنکبوت یا مکڑی کا جال ہے جو اس میں پھنس گیا وہ بڑی مشکل سے نکل پاتا ہے۔مرکزی کردار کی فیک آئی ڈی بنانے کی سوچ اور خوشی کا جلوہ یوں دکھایا گیا ہے:

''وہ کچھ دنوں تک ادھیڑبُن میں رہا کہ اپنے لئے کون سی آئی ڈی منتخب کرے۔ایک دن غنودگی کے عالم میں ایک نام ذہن میں ابھر۔۔اٹائیگر ووڈ(_ tiger wood)وہ خوش ہوا اور حیران بھی کہ داخلیت کے کس گوشے میں اس کی یہ پہچان چھپی بیٹھی ہے۔۔؟اس کو لگا ،ٹائیگر ووڈ اس کی ذات کے پہلو سے طلوع ہوا ہے۔۔وہ واقعی ٹائیگر ہے۔''

اسی طرح سوشل میڈیائی کلچر کی سائکی کے تعلق سے راجہ یوسف کا رومان پرور افسانہ ''نا قابل تنسیخ'' چیٹنگ کے نفسیاتی اتار چڑھاؤ سامنے لاتا ہے:

''میں جلدی جلدی مسینجر سے لاگ آوٹ ہوگیا۔ پھر گھبراہٹ میں کمپیوٹر ہی شٹ ڈاؤن کر دیا۔کافی دیر تک انگلیاں بالوں میں پھیرتا رہا۔قوت ارادی یکجا کرنے میں کافی دیر لگی۔''

فلم نگری کی زندگی جیسے موضوعات پر بھی کئی افسانے سامنے آئے ہیں۔جن میں تنویر تماپوری کا افسانہ ''لٹکتی تلوار'' بھی شامل ہے۔اس میں جدید دور کے جدید وسائل کی الجھنوں اور نفسیاتی بکھیڑوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔خصوصاً ممبئی کی فلم نگری کی پُرتعیش زندگی کے شہوت پرست(Lustful)عفریت کا بھیانک روپ دکھایا گیا ہے اور افسانے کا یہ جملہ مہانگری کی داخلی کہانی کی پوری عکاسی کرتا ہے کہ ''یہ کہنا مشکل تھا کہ بالی وُڈ میں فلمیں زیادہ بنتی ہیں..... یا اسکینڈل۔''

ریزرویشن سسٹم جدید دور کا ایک اہم مسئلہ بن چکا ہے۔ڈاکٹر ایوناش امن کا افسانہ ''شیر کا احساس'' علامتی اسلوب کا حامل ایک ایسا افسانہ ہے جس میں مرکزی کردار شیر اور نوجوان (بھرت) ہیں۔افسانے میں علامتی بنیاد پر چڑیا گھر بھی موجود ہے۔چڑیا گھر ہندوستان کے سیاسی وسرکاری نظام کی علامت ہے اور شیر ریزرویشن پالیسی کی،جو ایک شیر بن کر قابل اور ذہین افراد کا خون چوس رہا ہے۔شیر ریزویشن کی صورت میں ایک استحصالی قوت کی حیثیت سے افسانے میں موجود ہے کیونکہ بھرت ایک اعلی تعلیم یافتہ (پی۔ایچ۔ڈی۔انگریزی)نوجوان ہے لیکن اس کے باوجود اس کا حق ریزرویشن کا شیر چھین لیتا ہے اور وہ قانونی طور پر کچھ بھی نہیں کرسکتا ہے۔

افسانہ ''ٹھنڈا جہنم'' (طارق شبنم) سیاچن گلیشر کی برفیلی فضا میں ڈیوٹی انجام دینے والی فوج کے نفسیاتی اور جسمانی کرب کی داستان سناتا ہے۔افسانے کا کلائمکس جاں بحق ہو رہے ایک آفیسر کی زبان سے دلدوز تاثر چھوڑ رہا ہے:

''ساتھیو .... مرتے وقت کوئی جھوٹ نہیں بولتا......میں سچ کہتا ہوں،یہ سب دھوکہ ہے فریب

ہے.... یہ محض جھوٹی انا کی تسکین کا مسئلہ ہے.....ورنہ یہ ٹھنڈا جہنم کسی انسان کا علاقہ نہیں ہوسکتا۔‘‘

جدید افسانوں میں کہیں کہیں اصلاحی واخلاقی پہلو بھی نظر آتا ہے۔ڈاکٹر فیض قاضی آبادی کا افسانہ ’’رنگین چوک سے لال چوک تک‘‘ ایک ایسا اصلاحی نوعیت کا افسانہ ہے جس میں جمال الدین کا کردار ایک مصلح کی حیثیت سے موجود ہے اور جس کے اصلاحی مشن سے سیکڑوں خواتین باعزت زندگی گزرانے میں کامیاب ہوجاتی ہیں۔اسی طرح ناصر ضمیر کا افسانہ ’’عجیب درویش لڑکی تھی‘‘ میں رومانوی فضا موجود ہونے کے باوجود لڑکی کی کردارنگاری میں فینٹیسی اور پینٹنگ کا ملا جلا اثر دکھائی دیتا ہے:

’’میں کبھی کبھی زندگی سے مایوس ضرور ہوجاتی ہوں، پر نا امید کبھی نہیں۔اس لئے آپ کو میری ہر پینٹنگ میں زندگی ملے گی، امید ملے گی، خوشی ملے گی۔‘‘

عصری مسائل میں کسان آندولن بھی ایک گھمبیر مسئلہ بن چکا ہے۔ڈاکٹر رافعہ ولی کا افسانہ ’’تپسیا‘‘ کسان آندولن کی دلخراش کہانی سنا رہا ہے۔سکھبیر کی ماں اور بیوی کو اپنے کھیتوں سے اتنی محبت ہوتی ہے کہ ماں کے مرنے کے بعد وہ کھیت میں ماں کے کپڑوں کا بجوکا بناتا ہے اور جب وہ بجوکا کے سامنے نمن کے لئے جھکتا ہے تو اس واقعہ کے ذریعے افسانہ نگار نے ماں اور کھیتوں کی محبت کو یوں ظاہر کیا ہے:

’’وہ صبح کھیت میں بجوکا کے سامنے نمن کے لئے جیسے ہی جھکا تھا اُسے محسوس ہوا کہ بجوکا کا اونی دوپٹہ اس سے لپٹ چکا ہے۔سرسراتی باہیں اس کو آغوش میں لینا چاہتی ہے۔وہ بجوکا کے قریب ہوتا گیا۔میری پیاری ماں۔وہی بجوکا اس سے لپٹ گیا۔‘‘

اس کے علاوہ بہت سارے جدید مسائل وموضوعات کو بھی اردو افسانے کا حصہ بنایا گیا ہے۔جن میں شہری زندگی کے جدید مسائل، بڑا کلچر، سیلابی تباہ کاریاں، کسان آندولن، سائبر کرائم، جنگی جرائم، ماحولیاتی آلودگی، سائنسی پیش رفت، میڈیائی کلچر، میچ فکسنگ، وغیرہ شامل ہیں۔ان موضوعات پر کئی افسانہ نگاروں کے افسانے شائع ہوچکے ہیں۔جن میں افسانہ ’’19 مارچ/2350‘‘ (نورالحسنین) ’’اڑان‘‘ (نورشاہ) ’’کیمیکل‘‘ (سید تحسین گیلانی) ’’شمال کی جنگ‘‘ (نعیم بیگ) ’’شہر‘‘ (ترنم ریاض) ’’آزاد قیدی‘‘ (فیصل نواز چودھری) ’’بلیک ہول‘‘ (نورالعین صحرا) ’’ان ٹیوشن‘‘ (سبین علی) ’’جنت کی چابی، تیسری جنگ عظیم سے قبل، تاج محل اور گئو شالہ‘‘ (ریاض توحیدی) ’’ہارے ہوئے میچ کی جیت‘‘ (منیر احمد فردوس) ’’بڑا بوائے‘‘ (توصیف بریلوی) وغیرہ افسانے شامل ہیں۔

مجموعی طور پر اگر نئی صدی میں اردو افسانے کے نئے موضوعات اور سمت ورفتار کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے تو یہ موضوع ایک کتاب لکھنے کا تقاضا کرتا ہے۔اس مقالے میں راقم نے مُشتے نمونہ ازخروارے کے مثل جستہ جستہ جائزہ لینے اور مثالیں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

❑❑❑

نازؔ پرتاپ گڑھی
تیلیا کوٹ، رائے بریلی- Mob.9415722728

غزل

جب گئی پرواز تجھ تک فکر کی
آ گئی خوشبو غزل میں عطر کی

تجھ سے ملنا عید کی معراج ہے
راہ دیکھے کون عید الفطر کی

تیری چاہت کی عجب منزل ہے یہ
ہجر میں تلخی نہیں ہے ہجر کی

بس جنوں ایسا ہے جس کو چھوڑ کر
سب کو پڑتی ہے ضرورت خضر کی

پھر پریشاں ہے مری ذہنی لغت
پھر گھڑی آئی ہے تیرے ذکر کی

فخر کو بس فخر تک محدود رکھ
فخر سے آگے ہے منزل کبر کی

تو دہائی بن گیا تیرا کرم
ورنہ کیا اوقات تھی مجھ صفر کی

●●●

جمیل احمد جمیلؔ
اشرف آباد، لکھنؤ- Mob.9415780888

غزل

ظلم سے جنگ پہ تیار نہیں ہیں ہم لوگ
زندہ رہنے کے بھی حق دار نہیں ہیں ہم لوگ

ہم ہیں دیوانے، سمجھ دار نہیں ہیں ہم لوگ
کسی رستے کی بھی دیوار نہیں ہیں ہم لوگ

شہر میں آگ لگاتے نہیں ہم اہل وفا
اس طرح کا کوئی اخبار نہیں ہیں ہم لوگ

اس زمانے میں بھی کرتے ہیں وفا کی باتیں
کون کہتا ہے کہ گنہگار نہیں ہیں ہم لوگ

بے سبب خون خرابہ نہیں کرتے ورنہ
کوئی ٹوٹی ہوئی تلوار نہیں ہیں ہم لوگ

ہوش میں آؤ اب الزام تراشی نہ کرو
ہاں مسلمان ہیں، غدار نہیں ہیں ہم لوگ

ہم بھی زندہ ہیں تو کچھ حق ہے ہمارا بھی جمیلؔ
گذری تاریخ کے آثار نہیں ہیں ہم لوگ

●●●

اکٹرمحمد مستمر(اسسٹنٹ پروفیسر)
ذاکرحسین دہلی کالج، دہلی۔۲
رابطہ: 89208 60709

میں زندہ زبان ہوں!

میں ایک زندہ زبان ہوں۔اس سے پہلے میں اپنے بارے میں آگے عرض کروں میں اپنے منہ مٹھومیاں بننے والی بات نہیں کررہی ہوں بلکہ حقیقت خودکومنوالیتی ہے۔ میں یہ بات کیوں نہ کہوں کہ میں ایک زندہ زبان ہوں۔اگرچہ میری عمرزیادہ نہیں ہے مگرایسا بھی نہیں کہ دوسری ترقی یافتہ زبان انگریزی سے میری تاریخ کوئی کم نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے آج بین الاقوامی نوعیت کی سرپرستی حاصل ہے۔لیکن جہاں تک اس کی پیدائش نشوونمااورتشکیل کاتعلق ہے وہ بالکل میری طرح ہی ہے۔ جس طرح میں نے دوسری قدیم زبانوں عربی، فارسی، سنسکرت وغیرہ سے الفاظ مستعار لیے ہیں،ٹھیک اسی طرح انگریزی نے لاطینی، یونانی،فرانسیسی اور دوسری زبانوں کےلفظوں سے روپ اختیارکیاہے۔اگرچہ یہ ایک ترقی یافتہ اور عالمی سطح کی زبان ہے لیکن میرے بولنے والوں کی تعدادبھی کم نہیں ہے.....اور جب یہاں انگریز بستے تھے تو انہوں نے بھی میری ترقی وترویج کے لیے اعلیٰ سطح پر سرکاری اور غیرسرکاری طور پر بہت بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔اس زمرے میں ڈاکٹرجان گل کرسٹ کا نام سرِفہرست ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ میں ایک زندہ زبان ہوں۔ میں یہاں یہ بات مدلل طور پر پیش کرنا چاہوں گی۔ اس سے دوسری زبانیں یامیری مائی جائی بہنیں یہ نہ سمجھ لیں کہ میں انہیں چیلنج کررہی ہوں یاان سے کسی طور پرتعصب یا حسد کی شکارہوں۔مگر جہاں تک میرے زندہ زبان ہونے کاتعلق ہے وہ بالکل اظہرمن الشّمس ہے.....اور یہ بات سچ ہے کہ جو زبانیں دوسری زبانوں کے الفاظ قبول نہیں کرتی ہیں وہ مردہ ہوجاتی ہیں۔اس کی جیتی جاگتی مثالیں عبرانی، سنسکرت اور ژند زبانیں ہیں۔آج آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں سنسکرت زبان کا نام قریب قریب صفحۂ ہستی سے غائب ہے۔جبکہ دوسری زبانوں نے اس سے اس قدراستفادہ کیا کہ اس کی شمولیت سے صرف ان زبانوں کے دامن میں وسعت ہی نہیں آئی بلکہ اردو زبان میں توشگفتگی، شائستگی، فصاحت، بلاغت، البیلا پن، رسیلا پن، رنگینیت، زینت، نزاکت،نفاست،غنائیت،حلاوت،رومانیت، جمالیات اور جوبن بھی پوری طریقے سے درآیا ہے۔

یہ پہلو غور سے دیکھنا چاہیے کہ ہندی کی درسی کتابوں کا جو ابتدائی کورس یعنی آٹھویں کلاس تک جو کتابیں تیار کی جاتی ہیں اور کتاب میں سبق کے پیچھے یا جو گائڈ تیار کی جاتی ہے اور ان میں جو شبد ارتھ پیش کیے جاتے ہیں یعنی ہندی شبدوں کے جو ارتھ لکھے جاتے ہیں وہ سب کے سب اردو زبان کے ہوتے ہیں۔ کیا کبھی آپ نے ان پر غور کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے؟ شاید نہیں......!! اس لئے نہیں کی کیونکہ آپ نے وہ الفاظ اپنی ماں کی گود سے سیکھے ہیں اور انہی کو بچپن سے بولتے آ رہے ہیں.....اور یہ افسوس کی بات ہے کہ تعصب پرست لوگوں نے آپ کی آنکھوں پر زبان سے متعلق نفرت کا ایسا چشمہ چڑھا دیا کہ آپ نے اپنی فراست اور منطق سے بھی سوچنا چھوڑ دیا۔

روزمرہ کی زندگی میں آپ جتنے الفاظ بولتے ہیں ان میں زیادہ تر اسّی فیصد الفاظ میرے ہی ہوتے ہیں۔ میں اگر ان لفظوں کی گنتی کرانے لگوں تو اس پر ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے اور یہ نیک کام میں اپنے مشفق اور ہمدرد راقم الحروف سے اس مختصر مضمون میں تو لینا نہیں چاہوں گی مگر ان سے گزارش کروں گی کہ وہ ضرور میری تشنگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے الگ سے ایک کتاب ضرور سپرد قلم کریں تاکہ غیر زبان والے بھی میری اہمیت وافادیت سے واقف ہو سکیں۔ تاہم مختصر طور پر اپنی بات کو آگے بڑھاتی ہوں۔

ہاں......! جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ میں ایک زندہ زبان ہوں۔ اور مختصر طور پر میں یہاں اپنے زندہ ہونے پر روشنی ڈالتی چلوں گی۔ کتنے لفظوں کی گنتی کراؤں۔ کرسی، میز، صابن، کرتا، پاجامہ، ہوا، بارش، طوفان، آسمان، ستارے، چاند، سورج، رات، دن وغیرہ وغیرہ...... اسی طرح مصالحوں کے نام، پھولوں کے نام، پھلوں کے نام، مختلف گھریلو سامان، اسٹیشنری کا سامان، عدالتی کارروائی، دفتری کارروائی، پولیس تھانے کی کارروائی اور ان میں استعمال ہونے والے الفاظ۔ سرکاری اور غیر سرکاری محکمے میری لغت کے ہی محتاج ہیں جبکہ سرکار ہندی کے وہ لفظ رائج کرنا چاہتی ہے جن کو آپ کے کانوں نے کبھی سنا بھی نہیں ہے اور آپ کے ذہن تک ان لفظوں کی رسائی بھی نہیں ہو پاتی۔ ایسے کتنے ہی لفظ میں گنوا سکتی ہوں۔ جیسے جب سے دہشت گردی نے زور پکڑا ہے اور بم کی افواہیں پھیلنی شروع ہوئی ہیں تو لاوارث کی جگہ 'سند گدھ' کا لفظ استعمال کرنا شروع کیا ہے۔ اسی طرح آیورویدوالے دیسی ادویہ کے نام سنسکرت میں لکھ رہے ہیں جبکہ ان ناموں سے نہ دوکاندار واقف ہیں اور نہ ہی گاہک ان ناموں کو جانتے ہیں۔ چنانچہ دفتروں اور سرکاری کام کاج میں ایسے لفظوں کو داخل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جن سے عام ایم۔اے۔ ہندی پڑھے لکھے یا دفتری عملہ بھی واقف نہیں ہے۔ جو لوگ غیر ضروری اصطلاحات بنانے میں اپنی توانائی صرف کرتے ہیں ان حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ زندہ زبان بہتے ہوئے دریا کی مانند ہوتی ہے۔

یہ وصف اور مادہ قدرت نے مجھے عطا کیا ہے۔ میں دوسری زبانوں کے الفاظ کو تراش خراش کر اس طرح گول

مٹول، چکنا چپٹا، خوبصورت اور اپنے من موافق ایسی شکل دیتی ہوں کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں جبکہ یہ جوہر ہندوستان کی دوسری زبانوں میں موجود نہیں ہے۔ سنسکرت، ہندی اور یہاں تک کہ انگریزی کے سینکڑوں لفظوں کو بھی میں نے اتنی خوبصورتی اور سلیقے وقرینے سے تراشا اور خراشا ہے کہ ان لفظوں میں کشش، مدہوشی، سحر آفرینی، اثر انگیزی اور مٹھاس پیدا ہوگئی ہے۔ میٹھی زبان مجھے ایسے ہی نہیں کہا جاتا ہے جو لفظ میرے دریا کے پانی میں آکر مل جاتا ہے وہ میرا ہو جاتا ہے اور میرے پانی میں اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ اس کی مٹھاس پھر کبھی ختم نہیں ہوتی ہے۔

میں محبت کی زبان ہوں، عاشق کی چاہت ہوں، معشوق کی حسرت ہوں، خواب کی تعبیر ہوں، بہادر کی شمشیر ہوں، ایک تحریک ہوں، انقلاب ہوں، پسندیدہ گلاب ہوں، دن کا آفتاب ہوں، رات کا مہتاب ہوں، خرامِ ناز ہوں، شاہین کی پرواز ہوں، حق کی آواز ہوں، عشق کا آغاز ہوں، ہمالہ کی شوبھا ہوں، فضائے نکہت ہوں، شمع ہوں، پروانہ ہوں، قومی ترانہ ہوں، نامرادوں کی پناہ گاہ ہوں، مجروح دلوں کی آہ ہوں۔ الغرض میں زندہ زبان ہوں۔ عمدہ زبان ہوں۔

بات شہیدوں کی ہو یا وطن پرستی کی ہو، نغموں کی ہو یا فلموں کی ہو، ان سب کا وجود مجھ سے ہی ہے۔ میرے بغیر شہیدوں کی بات پوری نہیں ہوتی۔ دیش بھکتی کا بکھان نہیں ہوتا۔ وطن پرستی کا گن گان نہیں ہوتا۔ نغمہ نگاری اور فلموں کا جہاں تک تعلق ہے وہ میرے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی ہیں۔ فلموں سے اگر مجھ کو الگ کر دیا جائے تو فلموں کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ فلموں کے مکالموں پر نظر ڈالیے یا نغموں پر یا گیتوں پر یا ان میں استعمال ہونے والے جملوں پر سبھی میرے ہی محتاج ہیں۔ اگر فلموں سے مجھے ایک طرف کر دیا جائے تو ان کی حیثیت ایسی ہو جائے گی جیسے غبارے سے ہوا نکال دی جاتی ہے۔

عاشق میرے بغیر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہندی داں اور انگریزی داں ہو۔ میرا رنگ اپنی ذات اور بات پر چڑھانے کے لیے مجبور ہے۔ یہ کمال بھی مجھ میں ہی دیکھا جا سکتا ہے کہ میرے ہی لفظ جلدی سے زبان پر چڑھ جاتے ہیں۔ لوگوں کو دوسری زبان کی شاعری یاد نہیں رہتی اور لوگ موقع محل کے حساب سے میرے ہی شعروں کا سہارا لیتے ہیں اور سامنے والے شخص پر اپنا اثر چھوڑنا چاہتے ہیں۔ میرا عوام کی گلی کوچوں سے لے کر ایوان تک سکہ چلتا ہے۔ آج تک ایوان میں کسی منسٹر کو آپ نے اردو کے علاوہ کسی دوسری زبان میں شعر پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ جب کوئی دل سے بولتا ہے تو اردو میں بولتا ہے۔ چنانچہ میرا رشتہ دل اور دماغ سے ہے اور جب کوئی چیز دل اور دماغ میں رچ بس جاتی ہے تو اس کا نکال پانا بہت مشکل ہے۔ میں بھی دل اور دماغ میں سینکڑوں برسوں سے رچی بسی ہوں۔ اس لیے مجھے بھی آپ اپنے دل و دماغ سے نہیں نکال سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ میرا راج آج بھی لوگوں پر قائم ہے۔

❑❑❑

طلحہ تابشؔ
سہودر پور ویسٹ، پرتاپ گڑھ-Mob.9044676517

غزل

مسرت کے پرندے غم پہ جب یلغار کرتے ہیں
تو اک پل میں ہی اُجڑے دل کو یہ گلزار کرتے ہیں

محبت سے عقیدت سے ملا کرتے ہیں جو ہم سے
ہماری پیٹھ پر اکثر وہی تو وار کرتے ہیں

حیا ہے بے رُخی ہے خوف ہے یا ان کی مجبوری
کبھی بھی وہ کہاں ہم سے نگاہیں چار کرتے ہیں

قناعت اس پہ کرتے ہیں ہمیں جو کچھ بھی مل جائے
مسلسل غم کی آمد ہو تو اس سے پیار کرتے ہیں

سمجھتے ہیں گلوں کی طرح وہ ہر زخم دنیا کو
ہمیشہ ظرف والے درد کو بھی یار کرتے ہیں

وہی دیوانے ہوتے ہیں وہی عاشق ہیں کہلاتے
جو گل سی مسکراتی زندگی کو خوار کرتے ہیں

محبت، پیار، اُلفت جرم کہلائے اگر تابشؔ
تو ہم بھی اس کے مجرم ہیں چلو اقرار کرتے ہیں

●●●

غلام مصطفےٰ فرازؔ
چمن گنج، کانپور-Mob.9389279802

غزل

فریب کھائے ہوئے خود سے شرمسار بہت
وہ جن کو تارِ نفس کا تھا اعتبار بہت

تمام عمر تو خود میں ہے صورتِ دیگر
ذرا سی دیر کا ہوتا ہے انتظار بہت

یہ کس خرابے میں لے آئی آگہی مجھ کو
سکون کم ہے جہاں اور انتشار بہت

نہ چاکِ جیب و گریباں نہ حلقۂ زنجیر
فشارِ جاں کو ہے دامن کا ایک تار بہت

سفر سے دھوپ کا رشتہ بھی اک حقیقت ہے
شجر ہزار ہیں رستے میں سایہ دار بہت

یقین کیجئے دشمن کی زور مندی کا
نہ ایک کم ہے کسی سے نہ سو ہزار بہت

اک ایسی راہ پہ ڈالا گیا فرازؔ مجھے
قبا تو ایک ملی اور خار زار بہت

●●●

احتشام افسر
گورکھناتھ، گورکھپور-Mob.7905476790

مجنوں گورکھپوری اور اردو افسانے

مجنوں گورکھپوری کا شمار ہندوستان کے ان گنے چنے دانشوروں میں ہوتا ہے جنہوں نے ہر صنف ادب پر طبع آزمائی کی۔ مجنوں نے میدان ادب میں اپنے کمال اورفن کے خوب مظاہرے کیے اور بے مثال قابلیت کے جوہر دکھائے ہیں۔

آپ کا پورا نام احمد صدیق اور تخلص مجنوں تھا۔ والد کا نام محمد فاروق اور تخلص دوانہ تھا۔ وہ بھی باکمال معروف شاعر تھے۔ آپ کے والد اعلیٰ تعلیم یافتہ اور امام باڑہ اسٹیٹ کے منتظم تھے۔ مجنوں گورکھپوری کی پیدائش ۱۹۰۳ء میں بستی اور خلیل آباد کی سرحد پر واقع موضع بلدہ میں ہوئی اور ابتدائی تعلیم منجھریا میں ہوئی۔ مجنوں گورکھپوری نے مشن اسکول گورکھپور سے انٹرنس، علی گڑھ سے انٹرمیڈیٹ، سینٹ اینڈریوز کالج سے بی۔اے اور آگرہ یونیورسٹی سے ایم۔اے انگلش کے علاوہ کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔اے اردو کی ڈگریاں حاصل کیں۔

مجنوں گورکھپوری کی ملازمت کی ابتدا میاں صاحب اسلامیہ کالج سے بحیثیت لیکچرار شروع ہوئی۔ سینٹ اینڈریوز کالج اور گورکھپور یونیورسٹی سے بھی وابستہ رہے۔ پھر علی گڑھ یونیورسٹی میں ریڈر منتخب ہوگئے۔ پھر ۱۹۶۳ء میں پاکستان چلے گئے۔ کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر منتخب ہوئے اور ریٹائر ہونے کے بعد تادم مرگ وہیں مقیم رہے۔ ۴ر جون ۱۹۸۸ء کو ان کا انتقال ہوا۔

اردو افسانہ نے ایک صدی سے کچھ زیادہ کا سفر طے کرلیا ہے مگر اس سفر میں وہ جس پیچ وخم سے گزرا ہے اور جتنی تیزی کے ساتھ اس نے اپنے اندر وہ صلاحیت پیدا کی ہے کہ دنیا کی کسی بھی زبان کے افسانوی ادب سے آنکھیں ملا سکے تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اردو افسانے کی عمارت جس بنیاد پر کھڑی ہے اس کی کی خشت اول گورکھپور میں رکھی گئی اور بہت با صلاحیت ہاتھوں نے اس عمارت کی تعمیر کی۔ ایک طرف منشی پریم چند تھے تو دوسری طرف سجاد حیدر یلدرم۔ ایک طرف حقیقت نگاری تھی تو دوسری طرف جمالیات۔ مجنوں گورکھپوری ان دونوں کے درمیان موجود کڑی کا نام ہے۔ جنہوں نے رومانیت کے ساتھ ساتھ اردو افسانوں میں فکر و تامل کی صلاحیت پیدا کی۔ منشی پریم چند کا افسانہ 'سوزِ وطن' منظر عام پر آچکا تھا۔ یہ افسانہ حقیقت اور شعریت کے ساتھ ساتھ زندگی کی صداقتوں کو اجاگر کررہا تھا یعنی ادب لطیف بھی تھا اور حقیقت کا آئینہ دار بھی۔

مجنوں گورکھپوری نے ۱۹۲۰ء کے آس پاس افسانہ نگاری کی دنیا میں قدم رکھا اور لکھتے بھی خوب تھے۔ 'زیدی کا

حشر' جیسا ان کا افسانہ بہت کم عرصے میں لکھا گیا۔ مجنوں کے افسانوں میں کوئی مقصد نہیں ہوتا تھا وہ خود فرماتے ہیں کہ:

''میرا ذاتی رجحان تو فلسفے اور تنقید کی طرف تھا لیکن ایک طرف تو نیاز صاحب نے، دوسری طرف عوام کی روش نے مجھے افسانہ طرازی کی طرف مائل کر دیا۔''

مجنوں نے افسانے کم لکھے ہیں اور خود کو افسانہ نگار تسلیم کرنے میں تامل سے کام لیتے ہیں اور کہہ ڈالتے ہیں کہ افسانہ میری زندگی کا نصب العین نہیں تھا۔

مجنوں نے اپنا پہلا افسانہ 'گہنا' لکھا اور اس کی ابتداء ۱۹۲۵ء میں ہوئی۔ ان کے افسانے اور ناولٹ دونوں ہی مغربی ادب سے متاثر نظر آتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مجنوں کے افسانے طبع زاد نہیں ہیں۔ مجنوں جن افسانوں کے لئے سب سے زیادہ مشہور ہوئے وہ 'سمن پوش'، 'جشن عروسی'، 'مدفن تمنا' اور 'بیگانہ' ہیں۔

'سمن پوش'، 'تم میرے ہو'، 'حسن شاہ' وغیرہ میں مجنوں کا اپنا رنگ نمایاں ہے جہاں مشرق اور مغرب کا سنگم نظر آتا ہے لیکن مجنوں مشرقی اقدار کے زیادہ قریب تھے۔ ان کے افسانوں کی فضا پر گورکھپور اور آس پاس کا ماحول اور فضا صاف نظر آتی ہے، جہاں وہ پلے بڑھے اور پروان چڑھے تھے۔

مجنوں گورکھپوری نے جو افسانے لکھے ان میں 'زیدی کا حشر'، 'صید زبوں'، 'خواب و خیال' اور 'سمن پوش' اور 'ہنسا' وغیرہ مشہور ہیں، جن کی بدولت ان کا شمار اردو کے عظیم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

'زیدی کا حشر' ایک ناولٹ کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اس میں نیاز فتح پوری کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ مجنوں کے افسانوں کا مجموعہ ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا جبکہ پہلا افسانہ 'گہنا' نگار میں شائع ہوا تھا۔ افسانے کا بنیادی موضوع زیورات سے ہندوستانی عورتوں کی محبت ہے جو المیہ کی منزل تک پہنچتا ہے جبکہ 'سمن پوش' جو ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا، اس میں روحانی فضا ہے، اور ایک ڈرامائی کیفیت ہے جو آخر تک اپنے قاری کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ افسانے کی ہیروئین ناہید ہے جس کی روح مرنے کے دو دہائی بعد تک بے چین رہتی ہے اور اپنے قتل کا راز بتانے کو بے قرار ہے۔ ان کا تیسرا افسانہ 'حسنین کا انجام' ہے جس میں مجنوں لکھتے ہیں کہ انسان کی گمراہیوں کا دور جب ختم ہوتا ہے تو اس کی قوت حس تیز ہو جاتی ہے۔ حسنین کی آنکھوں سے پردے ہٹ گئے تو اندھوں کی طرح کائنات اس کی نگاہ میں سیاہ داغ بن گئی۔ اسی طرح ۱۹۲۷ء میں 'گو ہر تم میرے ہو' اور 'مراد' جیسے افسانے بھی نگار میں شائع ہوئے جس کا نقطۂ نظر رجائی رہا۔

مجنوں ایک ایسے افسانہ نگار تھے جن کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ان کے یہاں رومانیت غالب ضرور ہے مگر محبت کا انجام المیہ پر ہی ہوتا ہے۔ افسانوں کے بعد ناول نگاری کی طرف مائل ہو گئے۔ مجنوں کے کردار کبھی فرشتہ صفت ہو جاتے ہیں، کبھی نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار ہو جاتے ہیں مگر ان کے افسانوں کا انجام بڑا مؤثر ہوتا ہے جن میں جذبات نگاری نفسیات اور حسیت

کے ساتھ جزویات نگاری اسے دو آتشہ بنا دیتی ہے۔ بنیادی طور پر ان کے افسانوں کو نظر انداز اس لئے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ انھوں نے نفسیات کے سہارے کردار کے باطن میں جھانکنے کی کوشش کی ہے جو اردو افسانے میں بالکل نئی چیز تھی۔

مجنوں گورکھپوری نے ترجمے میں بھی ہاتھ آزمائے۔ 'سنگھاسن بیتی'، 'مریم مجد دانی'، 'قابیل'، 'ابوالحمراء' 'آغاز ہستی'، 'سالوی'، 'کنگ میئر'، 'سینٹ جون' وغیرہ ان کے اہم تراجم ہیں۔

انھوں نے خطوط نویسی پر توجہ دی تو 'پردیسی کے خطوط' نام سے ان کے آٹھ خطوط کا مجموعہ ۱۹۶۱ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔

مجنوں نے تنقید نگاری میں بھی نام کمایا۔ تنقیدی حاشیہ ۱۹۴۷ء، نقوش افکار ۱۹۵۵ء اور منزل سرا، ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئے۔ فن افسانہ نگاری پر ان کی مکمل کتاب موجود ہے۔

الغرض مجنوں گورکھپوری گوناگوں شخصیت کے مالک تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور افسانہ نگار بھی، مترجم بھی اور نقاد بھی۔ اتنی ساری خوبیاں شاید ہی کسی ایک ادیب یا دانشور میں ملیں۔ انھوں نے ۱۹۳۱ء میں ماہنامہ 'ایوان' نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس کے مدیر بھی وہ خود تھے۔ یہ ماہ نامہ چار سال تک جاری رہا۔ اس میں معیاری مضامین اور کلام شائع ہوتے تھے۔

□□□

تخلیق کاروں سے گذارش

اپنی تخلیقات/نگارشات صفحہ کے ایک طرف ہی لکھیں۔ ہر تخلیق پر غیر مطبوعہ کی تصدیق ہونا لازمی ہے۔

ای۔ میل سے بھیجی ہوئی تخلیقات/نگارشات کی ہارڈ کاپی جس پر آپ کا پتہ اور موبائل نمبر صاف صاف درج ہو، بھیجنے کی زحمت کریں۔

جو تخلیقات کسی وجہ سے شائع نہیں ہوں گی، ان کی واپسی کے لئے اکادمی ذمہ دار نہیں ہوگی۔

تخلیقات کے ساتھ بینک اکاؤنٹ میں درج نام، بینک کا نام، شاخ کا نام، آئی۔ ایف۔ ایس۔ سی نمبر انگریزی میں لکھ کر بھیجنا ضروری ہے۔ پاس بک کی فوٹو کاپی یا کینسل چیک بھی منسلک کرنے کی زحمت کریں۔

اترپردیش اردو اکادمی بچوں کے مزاج و معیار کے لحاظ سے

ماہنامہ **باغیچہ**

پورے آب و تاب کے ساتھ شائع کر رہی ہے۔ اس کے فروغ اور توسیع کے لئے آپ کا تعاون درکار ہے۔

۱۔ آپ اپنی تخلیقات بھیج کر

۲۔ خود خریدار بن کر اور دوسروں کو ترغیب دے کر

۳۔ بچوں میں اردو رسائل پڑھنے کا ذوق بیدار کر کے

اردو کی خدمت کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر نیازؔ سلطانپوری
بھٹی جرولی، کٹاواں، سلطانپور-Mob.8756228058

غزل

لب پہ شکوہ نہ آہ و زاری ہے
کس قدر خوف سب پہ طاری ہے

کون ملتا ہے بے غرض کس سے
آج ہر شخص کاروباری ہے

اک اشارے پہ ناچتے ہیں سبھی
وقت کتنا بڑا مداری ہے

رنج و غم، خوف و یاس، تنہائی
اِن سبھی سے ہماری یاری ہے

جھک کے ملتا ہے ہر کسی سے وہ
جس کی فطرت میں انکساری ہے

دیکھئے کون کس سے جیتے گا
جھوٹ اور سچ میں جنگ جاری ہے

اپنا سر خود بچاؤ یار نیازؔ
اِن دنوں خوب سنگ باری ہے

●●●

عمر شریفؔ مہوی
گوئن روڈ، امین آباد، لکھنؤ-Mob.6387246562

غزل

ہمیں کیا نا خدا کو بھی خدا کی یاد آتی ہے
بھنور میں گھر کے جب بھی کوئی کشتی ڈگمگاتی ہے

طلب دیدار کی دیکھو تو کیسے گل کھلاتی ہے
جدھر بھی دیکھتا ہوں ان کی صورت مسکراتی ہے

مجاہد قوم کو حاکم بنا کر رب نے بھیجا تھا
یہ کیوں محکوم ہو کر زندگی اپنی بتاتی ہے

یہ پروانے تو خود جلنے کا جذبہ دل میں رکھتے ہیں
تو پھر کیوں شمع محفل آنکھ سے آنسو بہاتی ہے

وہ جب بھی کھولتے ہیں اپنی زلفوں کی گھٹاؤں کو
خزاں ہو یا بہاراں ہو گھٹا گھر گھر کے آتی ہے

چمن میں سیر کو جس وقت وہ تشریف لاتے ہیں
لدی پھولوں کی ہر ڈالی ادب سے سر جھکاتی ہے

شریفؔ اُلفت کا کیسا کھیل کیسا امتحاں ہے یہ
کوئی خوشیاں مناتا ہے کسی کی جان جاتی ہے

●●●

ریحان عباس
ایڈیٹر ماہنامہ اردو ''نیا دور'' لکھنؤ-Mob.9838931772

دُور اندیشی

یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں علی گڑھ میں اپنی بڑی بہن کے گھر پر رہ رہی تھی اور یہیں سے میں اپنا گریجویشن کمپلیٹ کر رہی تھی۔ میرے والد محترم ریلوے سے ریٹائرڈ ہو چکے تھے، میری تینوں بہنوں اور ایک بھائی کی شادی ہو چکی تھی، اب صرف میں باقی تھی شادی کے لیے رشتے تو بڑے اچھے اچھے آرہے تھے لیکن میرا گریجویٹ ابھی کمپلیٹ نہیں ہوا تھا جس کی وجہ سے میری شادی میں تاخیر ہو رہی تھی۔ لوگوں کے زیادہ اصرار کرنے پر میرے والد سب کو جواب دیتے تھے کہ میری سبھی لڑکیوں کی شادی گریجویٹ کرنے کے بعد ہی ہوئی ہے، لہٰذا نسرین کی بھی شادی گریجویٹ کرنے کے بعد ہی ہوگی۔ میرے بڑے بھائی جن کا نام فاضل ہے، وہ سب بہنوں سے بڑے تھے لہٰذا اُن کی شادی سب سے پہلے ہوئی تھی اُس کے بعد میری تینوں بہنوں کی شادیاں ہوئیں۔ علی گڑھ میں ایک رجسٹرار آفس میں میرے بہنوئی ہیں اور دوسرے اے ایم یو میں، تیسرے علی گڑھ ہی میں میڈیکل کالج میں ڈاکٹر ہیں۔ رہنے والے ہم لوگ فتح پور کے ہیں لیکن فتح پور میں بہت کم رہے کیونکہ میرے ابو کا ریلوے میں ملازم ہونے کی وجہ سے آئے دن ٹرانسفر ہوتا رہتا تھا اس لیے ہم لوگوں نے شہر شہر گھوما اور اب جب وہ ریٹائرڈ ہو گئے تو لکھنؤ میں ایک مسجد میں نماز پڑھانے لگے۔

ابو کی شوگر بڑھی رہتی تھی اس لیے ہم لوگ آئے دن اُن کو جب بھی موقع ملتا لکھنؤ دیکھنے آتے تھے اور اُن کی طبیعت زیادہ خراب ہونے پر فاضل بھائی صاحب اپنے ساتھ فتح پور لے جاتے تھے اور جب طبیعت تھوڑی ٹھیک ہوتی تھی، وہ پھر لکھنؤ آجاتے تھے، دراصل وہ تالکٹورہ، لکھنؤ میں ایک مسجد کی دیکھ ریکھ بھی کرتے تھے اس لیے وہاں کے مومنین اُن کو بہت چاہتے تھے اور اُن کی قدر بھی کرتے تھے لہٰذا ہم لوگوں نے بھی سوچا کہ ابو کا دل بہلا رہتا ہے اس سے اچھی کیا بات ہوگی، ایک دن گرمیوں کی چھٹی میں ہم لوگ لکھنؤ ابو کو دیکھنے آئے تھے، وہیں مسجد کے کیمپس میں ایک اچھا سا کمرہ بنا ہوا تھا اُسی میں والد صاحب رہتے تھے، جس کو موقع ملتا تھا وہ ابو کی خدمت کر دیا کرتا تھا اس بار مجھے موقع ملا لہٰذا میں اپنی بڑی بہن کے ساتھ لکھنؤ اُن کی خدمت کرنے آگئی، پاس ہی میں ایک ہوٹل تھا وہیں سے کھانا ابو کے لیے آجاتا تھا، لیکن جب سے میں آئی تھی کھانا بنانے لگی تھی اور ابو بہت خوش تھے کہ اُن کی بیٹی اُن کے لیے کھانا بنا رہی ہے۔ ایک دن کھانا کھاتے ہوئے انھوں نے مجھ سے کہا کہ اب صرف تمہارے ہاتھ پیلے کرنا باقی ہیں بقیہ بہنوں کی شادی تو ہو چکی ہے اب صرف تم بچی ہو، اس سال انشاء اللہ تمہارا گریجویشن ہو جائے گا، میں نے بات کاٹتے ہوئے ابو سے کہا کہ ابو! آپ اپنی

صحت کا خیال رکھیے، جس پر ابو نے کہا کہ بیٹا کیسی صحت، ایک دن تو اس جسم کو مٹی میں ملنا ہے صرف تمہاری شادی کی حسرت لیے زندہ ہوں کہ کب تمہارا گریجویشن ہوجائے اور تمہیں بھی ہنسی خوشی رخصت کرسکوں۔

ایک دن ابو نے کہا کہ چلو آج جمعرات ہے تم لوگوں کو درگاہ حضرت عباس لے چلتا ہوں جہاں پر ہزاروں لوگ آتے ہیں اور سب کی مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ ایک میرے ملنے والے ہیں اُن کے صاحبزادے پرائیوٹ کار چلاتے ہیں لہٰذا اُن سے میں نے کہہ دیا ہے شام کو سات بجے کے قریب ہم لوگ اُسی کار سے چلیں گے۔ میں علی گڑھ میں رہتی تھی لہٰذا وہاں کی مجھے عادت سی پڑ چکی تھی، رہن سہن میرا علی گڑھ کا تھا، وہاں اے ایم یو کیمپس میں رہنے کی وجہ سے شہر کم جانا ہوتا تھا سوائے تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ کوئی کام وہاں پر نہ تھا، وہاں کا ماحول ہی پڑھائی کا تھا، چاروں طرف دور دور سناٹا رہتا تھا اور باقی یونیورسٹی میں کلاس اٹینڈ کرنے جاتی تھی لیکن یہاں لکھنؤ میں زبان کا بہت فرق تھا، جب شام کو گاڑی ہم لوگوں کو لینے آئی تو اُس میں سے ایک خوبصورت اور لحیم شحیم نوجوان اترا۔ اُس نے بڑی تعظیم سے جھک کر میرے والد صاحب کو سلام کرتے ہوئے مصافحہ کیا اور کہا دیکھیے میں وقت سے پانچ منٹ قبل آ گیا ہوں۔ سب لوگ تیار ہیں چلنے کے لیے۔ میرے والد صاحب نے اعجاز سے کہا کہ ہاں ہاں سب تیار ہیں لیکن پہلے آپ بیٹھیے چائے ایک کپ ہوجائے اُس کے بعد سب لوگ چلتے ہیں۔ جہاں پر ابو رہتے تھے وہ ایک ہی کمرہ تھا ایک پلنگ بچھا ہوا تھا اور چار کرسیاں تھیں، کام چلانے کے لیے ایک پردہ کھینچ کر باورچی خانہ بنا لیا گیا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ چائے بنانا ہے جب تک ابو نے آواز دے دی اور کہا کہ نسرین جلدی سے چائے لاؤ پھر ہم لوگ چلتے ہیں۔ اعجاز بولے کہ نہیں چائے کی زحمت بالکل نہ کیجیے تاخیر ہوجائے گی تو وہاں بہت بھیڑ ہوجائے گی کیونکہ آج نوچندی جمعرات ہے اور وہ بھی ماہ رجب کی۔ لوگ بہت دور دور سے آتے ہیں اور شام کو کچھ زیادہ ہی بھیڑ رہتی ہے۔ بہرحال جب تک یہ لوگ باتیں کرتے رہے میں چائے بنالائی اور چائے پینے کے بعد ہم لوگ درگاہ کے لیے نکل پڑے۔ میرے والد صاحب کو اعجاز نے بڑے سلیقے سے گاڑی میں اُن کا ہاتھ پکڑ کر بٹھایا کیونکہ میرے ابو کو چلنے میں تھوڑی دشواری ہوتی تھی اور جب ہم لوگ سب بیٹھ گئے تب اعجاز نے پوچھا کہ کیا اب چل سکتے ہیں سب بیٹھ گئے۔ میرے والد نے اجازت دے دی۔

گاڑی جب چلی تو میں نے دیکھا کہ اعجاز اپنی ڈرائیونگ سیٹ سے بیک مرر کے ذریعہ مجھے دیکھ رہے ہیں، اور کئی بار میری اُن سے نظریں بھی دوچار ہوئیں، میں علی گڑھ کی اسٹوڈنٹ تھی، لڑکوں کے ساتھ کلاس اٹینڈ کرتی تھی لیکن وہاں پر کبھی بھی ایسا کچھ محسوس نہ ہوا جو آج محسوس ہورہا تھا، بہرحال کار مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے درگاہ شریف کے گیٹ پر پہنچی بہت ہی زیادہ بھیڑ تھی، راستہ بھی جام ہورہا تھا چلنے میں دشواری ہورہی تھی، اعجاز نے کہا کہ میں آپ لوگوں کو گیٹ پر اتار رہا ہوں پھر کہیں دور پر گاڑی کھڑی کر کے آتا ہوں یہ کہہ کر اعجاز نے ہم لوگوں کو درگاہ کے گیٹ پر اتار دیا اور کہا کہ یہیں پر کنارے کھڑے رہیے میں فوراً آتا ہوں۔ تھوڑی دیر بھی نہیں ہوئی تھی کہ اعجاز آ گئے اور ہم لوگوں کو درگاہ

کی زیارت بڑے سلیقہ سے کرائی جس سے میں بھی بڑی متاثر ہوئی۔ وہیں درگاہ کے پاس نجف اور شہزادیٔ کونین کا روضہ بھی تھا جہاں کی ہم لوگوں نے زیارت کی۔ اعجاز سب زیارت کراتے جارہے تھے اور بتاتے جارہے تھے کہ یہ حضرت علی کا روضہ ہے اس کو نجف کہتے ہیں اور یہ بیت الحزن ہے یہ شہزادیٔ کونین حضرت فاطمہ کا روضہ ہے جس کو فاطمین بھی کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ یہاں پر مانی گئی منت جلد پوری ہوتی ہے اس لیے آپ لوگ یہاں کی زیارت کیجیے میں آتا ہوں یہ کہہ کر اعجاز بھیڑ میں گم ہوگئے اور پندرہ منٹ بعد اندر سے نکلتے ہوئے دکھائی دیے۔

ہم لوگ درگاہ سے نکلے اور وہاں سے سیدھے مبین کے ہوٹل جو اکبری گیٹ پر واقع تھا پہنچ گئے کیونکہ یہاں کی نہاری اور کلچے بہت مشہور تھے، جمعرات کے دن نخاس میں بالکل سناٹا رہتا ہے لیکن اس وقت یہاں کی رونق ایسی تھی کہ پاؤں رکھنے کی بھی جگہ نہیں تھی، کافی دیر تک ہم لوگوں کو ہوٹل میں کھڑے رہنا پڑا تب کہیں جا کر ہم لوگوں کو جگہ مل سکی۔ آڈر دیا گیا، ابو نے کہا تھا کہ ہم تو پرہیزی کھاتے ہیں لیکن تم لوگوں کا ساتھ دے دیں گے لہٰذا اُن کے لیے بریانی منگائی گئی جس میں سے بوٹیاں نکال کر صرف تھوڑا سا چاول اُن کو دیا گیا جو اُن کے لیے کافی تھا۔ کلچہ نہاری آگیا اور جب ہم لوگوں نے کھانا کھایا تو واقعی نہاری اتنی لذیذ تھی کہ شاید ہی میں نے اپنی زندگی میں کبھی کھائی ہو۔ ابو کے ساتھ ہم لوگ کافی شہروں میں رہے لیکن کبھی بھی اتنا لذیذ کھانا نہیں کھایا تھا، اب میری سمجھ میں آیا کہ اتنی بھیڑ اس ہوٹل پر کیوں ہوتی ہے؟ اعجاز میرے ابو کو بتا رہے تھے کہ یہ مبین کا ہوٹل ہے۔ ایک چوک کے اندر ہوٹل ہے وہ رحیم کا ہوٹل ہے وہاں بھی بہت بھیڑ رہتی ہے۔ رحیم ہوٹل کے سامنے ہی ٹنڈے کباب والے ہیں جہاں پر بیٹھنے کے لیے جگہ بڑی مشکل سے ملتی ہے، لغرض ہم لوگ کھانا کھا کر وہاں سے گھر واپس آگئے اور اعجاز بھی ہم لوگوں سے مل کر رخصت ہوگئے۔

اعجاز کے جانے کے بعد ابو نے مجھ سے اور بڑی بہن سے پوچھا کہ یہ اعجاز کیسا لڑکا ہے کیا تم لوگوں کو نسرین کے لیے پسند ہے اگر پسند ہو تو بات آگے بڑھائی جائے۔ نسرین نے پوچھا کہ یہ کون ہے کیا کرتا ہے؟ اور ان کے گھر کی بیک گراؤنڈ کیا ہے سب کچھ پتہ کیجیے تب ہم لوگ کچھ بتائیں گے۔ ابو نے بتایا کہ علی گڑھ میں جہاں تم رہتی ہو وہیں سے تھوڑی دور پر اعجاز کے بہنوئی بھی رہتے ہیں جو پراکٹر آفس میں ہیں۔ انہیں کا یہ سالا ہے، بڑے سالے سکریٹریٹ لکھنؤ میں افسر ہیں اور اعجاز نے انٹر کیا ہے، آگے تعلیم حاصل کرنے میں دل نہیں لگا اُن کے بڑے بھائی نے ان کو ایک ماروتی کی ڈیزائر کار دلا دی ہے جس سے کہ یہ اپنے پیر پر خود کھڑے ہوسکیں۔ اعجاز کا نیٹ ورک صرف مولاناؤں کا ہے جو مجلسیں اور محفلیں پڑھنے لکھنؤ سے باہر اعجاز کی کار سے جاتے ہیں، یہ نہ کسی سروس کرنے کے موڈ میں ہیں اور نہ کوئی نوکری یہ ہے اعجاز کی داستان۔ اعجاز کی بڑی بہن تمہاری بڑی بہن کی دوست ہیں انھوں نے بھی اعجاز کو پسند کیا ہے کیونکہ اعجاز پورے اترپردیش میں مولاناؤں کے ساتھ آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ ایک دن اعجاز علی گڑھ آئے تھے تو ان کی بڑی بہن ان کے ساتھ تمہاری بہن سے ملنے آئی تھیں۔ انھوں نے ہی یہ رشتہ دیا ہے ہاں عمر میں تھوڑا فرق ہوگا کیونکہ اعجاز نے

انٹر پاس کیا ہے اور تم گریجویٹ کر رہی ہو، لیکن ایسا بھی فرق نہیں کہ پتہ چلے۔ہاں یہ بات الگ ہے کہ تمہارے سارے بہنوئی اونچی اونچی پوسٹ پر ہیں اور یہ کوئی نوکری نہیں کرتے سوائے اپنی گاڑی چلانے کے۔ بہرحال اب تم بہنوں کو سوچنا ہے نسرین کے رشتہ کے لیے اور بھی آئے ہیں کئی جگہ سے اس کو بھی دیکھ لو تب اپنے بھائی سے بتاؤ کہ کیا قدم اٹھانا ہے۔اس درمیان علی گڑھ دو بار اعجاز کسی نہ کسی بہانے آ چکے تھے اور میری ملاقات بھی ہوئی تھی، اب میرے دل میں بھی اُن کے لیے محبت گھر کر گئی تھی۔اسی طرح کافی دن گزر گئے اور میرا گریجویٹ بھی علی گڑھ سے مکمل ہو گیا اور میں علی گڑھ سے فتح پور اپنی والدہ کے ساتھ آ کر رہنے لگی۔

اب میرا دل فتح پور میں نہیں لگتا تھا کیونکہ علی گڑھ میں لائٹ بہت کم جاتی تھی اور فتح پور میں بہت زیادہ۔ گرمیوں میں بڑی بیچینی بڑھ گئی تھی، پڑھائی بھی رُک گئی تھی دن کا وقت کٹتا نہیں تھا، رات میں بھی نیند نہ آتی تھی کیونکہ گرمیوں کا مہینہ تھا، اسی میں بڑی بہن کا روز فون آتا تھا اور وہ روز کوئی نہ کوئی بات اعجاز کی بتاتی تھیں کہ آج اُن کے بڑے بھائی اپنی بہن کے ساتھ آئے تھے بہت ہی شریف لوگ ہیں۔اچھا خاندان ہے کیوں نہ تمہارا رشتہ یہاں ہم لوگ پکڑ لیں کیونکہ اُن کے بڑے بھائی کہہ رہے تھے کہ لڑکی کی قسمت سے سب کچھ ہوتا ہے اگر لڑکی کی قسمت اچھی ہوگی تو ہوسکتا ہے اعجاز کو کسی اچھی فرم میں ملازمت مل جائے اور آپ لوگ بھی تو ہیں شادی ہو جائے تو آپ ہی لوگ یہیں علی گڑھ میں کہیں پر سیٹ کرا دیجیئے گا۔تمہاری تینوں بہنوں کے یہاں اعجاز کے بڑے بھائی اپنی بہن کے ساتھ باری باری سے آئے اور میں تو بہت اچھی طرح سے اُن کی بڑی بہن کو جانتی ہوں کیونکہ میں اور وہ پہلے ایک ہی بلڈنگ میں رہتے تھے اب اُن کا فلیٹ بدل گیا ہے، میں تو اُن کے یہاں اور وہ میرے یہاں برابر آتے جاتے رہتے ہیں۔

میں نے پوچھا کہ ابو سے اس سلسلہ میں بات کی تو بڑی بہن بولیں کہ ابو سے ہم لوگوں نے بات کی تھی انھوں نے کہا کہ وہ فتح پور والا رشتہ پکڑو کیونکہ اعجاز لکھنؤ میں مولاناؤں کے ساتھ رہتا ہے صرف میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے کوئی کمائی دھمائی ہے نہیں۔میری لڑکی کو کیسے رکھے گا؟ جبکہ میں نے اپنی سبھی بیٹیوں کا ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اچھے سے اچھا رشتہ کیا ہے۔تمہارے ابو بالکل راضی نہیں ہیں اس شادی سے لیکن اگر کہو تو ہم لوگ ابو سے بات کریں۔اور وہ لوگ ۲۰/جون کو فتح پور تمہیں دیکھنے بھی آ رہے ہیں، ہم لوگوں سے پوچھ کر کیونکہ ہم تینوں بہنیں بھی ۱۸/جون کو فتح پور پہنچ جائیں گے۔ اعجاز نے اپنی والدہ سے نسرین کی بہت تعریف کی ہے۔اس لیے اعجاز کے والدین، اُن کی علی گڑھ والی بڑی بہن اور سکریٹریٹ والے بڑے بھائی، اعجاز کی دونوں بہنیں جن کی شادیاں ہو چکی ہیں وہ بھی آ رہی ہیں تمہیں دیکھنے کے لیے۔

دل میں ایک ہلچل سی مچی تھی، اور اتھل پتھل ہو رہی تھی سبھی لڑکیوں میں ایسا ہوتا ہے جب اُس کی شادی کی بات ہوتی ہے لیکن میں اعجاز سے مل چکی تھی اور سچ پوچھئے تو مجھے اعجاز بہت پسند آیا تھا لیکن معاملہ صرف کمائی پر آ کر اٹکا ہوا تھا، کہ وہ کچھ کرتا نہیں تھا صرف گاڑی سے کیا کام چلے گا یہاں پر آ کر مجھے بڑی بیچینی ہو رہی تھی، اور والد صاحب نے بھی اعجاز کی کمائی کی دہائی دی تھی کہ لکھنؤ والے تو صرف میٹھی

زبان کے مالک ہوتے ہیں، اور اُن سے کوئی امید نہ رکھنا۔ ویسے تو فتح پور کی کافی لڑکیاں کانپور اور لکھنؤ میں بیاہی تھیں لیکن سبھی لوگ بڑے آرام سے اپنی زندگی گزار رہے تھے کسی بھی قسم کی کوئی شکایت فتح پور میں کبھی نہیں آئی تھی۔ بس یہیں سے میرا دل بھی بے بس ہو جاتا تھا کہ کیا کروں؟ جب میری ساری بہنیں فتح پور آ گئیں تو سب بہنوں نے اپنے اپنے طریقہ سے مجھے سمجھایا کہ شادی کر و یا نہ کر و صرف سب سے بڑی بہن نے مجھے بتایا کہ تم ابھی ہاں مت کہو جلدی کیا ہے ایک دو جگہ اور رشتہ دیکھ لیتے ہیں، ایک الٰہ آباد کا لڑکا ہے وہ وکیل ہے کافی اچھا گھر ہے لیکن اُس کے چھوٹے بھائی کی طلاق ہو چکی ہے۔ ایک لڑکا لکھنؤ ہی میں درگاہ رستم نگر کا ہے جو انجینئر ہے ڈیڑھ لاکھ روپے اُس کی تنخواہ ہے لیکن وہ ذرا عمر دراز ہے شادی ابھی تک نہیں کی ہے کیونکہ اپنی دونوں بہنوں کے بچوں کی تعلیم کا اور اُن کے سارے اخراجات کو وہی برداشت کرتا ہے اس لیے اُس کی بہنیں کچھ نہ کچھ عیب نکال کر سارے رشتے واپس کر دیتی ہیں۔ رشتے تو تمہارے لیے بہت اچھے اچھے آئے ہیں صرف سلیکٹ کرنا باقی ہے۔

الگ الگ طرح سے مجھے سب لوگ سمجھاتے رہتے تھے اور میری سہیلیاں بھی مجھے سمجھاتی تھیں لیکن میں کوئی فیصلہ نہیں لے پا رہی تھی کیونکہ لڑکا بڑا اسمارٹ تھا، میرے سارے بہنوئیوں میں سب سے اچھا اور کمسن، لیکن کمائی میں سب سے تھکا ہوا یہیں پر میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ خیر ایک دن وہ بھی آ گیا کہ اعجاز کے گھر والے ایک بڑی گاڑی کر کے لکھنؤ سے فتح پور آ گئے اور اُن کے بڑے بھائی نے بھی مجھے دیکھ لیا سب لوگوں نے مجھے دیکھا کیونکہ میں علی گڑھ کی تعلیم یافتہ تھی مجھے اپنا دائرہ معلوم تھا، اعجاز کی والدہ گوری چٹی خوبصورت سی تھیں، اسی طرح اعجاز کے بڑے بھائی بھی گورے چٹے تھے، اور ان کی تینوں بہنیں بھی گوری چٹی تھیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ بہت اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اعجاز کی والدہ نے مجھے بڑی محبت سے گلے لگایا اور ایسا لگایا کہ معلوم ہوتا تھا کہ بہت دنوں کے بچھڑے ہوئے ہیں اسی طرح سے باری باری اعجاز کی بہنوں نے بھی مجھے گلے لگایا اور رسماً مجھ پر سے صدقہ اتارا۔ گیارہ بجے کے قریب یہ لوگ آ گئے تھے اور شام کے چھ بجے یہ لوگ لکھنؤ کے لیے روانہ ہوئے۔ روانہ ہونے سے قبل اعجاز کی والدہ نے کہا کہ اگر قسمت میں لکھا ہوگا تو تمہیں میری بہو بننے سے کوئی روک نہیں پائے گا، اعجاز کی والدہ کی گفتگو سے میرے دل کو بڑی تقویت پہنچی اور میرے دل نے سوچا کہ کتنے اچھے یہ لوگ ہیں، اپنا گھر بھی اعجاز کا ہے یعنی کہ باتوں باتوں میں اعجاز کی ممی نے بتایا کہ ایک گھر درگاہ میں ہم لوگوں کا اور ہے جو کرایہ پر اٹھا ہوا ہے ہوسکتا ہے کہ اعجاز شادی کر کے الگ اس گھر میں رہیں۔

اسی درمیان میرے والد کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہو گئی تھی اور شوگر حد سے زیادہ بڑھنے لگی تھی، ایک دن ابو بیہوش ہو کر مسجد میں گر گئے تھے، لہٰذا وہاں سے فون آیا تھا فاضل بھائی ابو کو کار میں بٹھا کر گھر لے آئے تھے، پھر اُس کے بعد لکھنؤ دوبارہ جانا اُن کا نہ ہوا۔ فکر حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی، ابو کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی اسی اثنا میں ایک سال گزر گیا کوئی رشتہ اچھا اور مل نہیں رہا تھا، کہیں پیسے والا تو عمر زیادہ، کہیں طلاق شدہ تو کہیں بے روزگار، اسی لیے ایک دن ہم بہنوں نے بیٹھ کر اس سلسلہ میں ایک میٹنگ کی اور اس میٹنگ

کا یہ نتیجہ نکلا کہ اعجاز ہی کے ساتھ رشتہ طے کردیا جائے۔ بہنوں نے اس کی دلیل دی تھی کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں کوئی چھوٹی ہوتی ہے تو کوئی بڑی۔ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ تم کہیں ہم لوگوں سے اور بہتر زندگی گزارو کوئی دیکھ کر نہیں آیا ہے۔ میں تھوڑا سا کسمسائی اور بڑی بہن سے بولی کہ اگر کوئی پوچھے گا تو آپ کیا کہیں گی کہ آپ کے شوہر تو لکچرر میرے شوہر ڈرائیور۔ بڑی بہن نے کہا کہ شادی کے بعد منع کردینا کہ ڈرائیوری نہ کرے، ڈرائیور رکھ لے اور ٹریول ایجنسی کھول لے۔ ہوسکتا ہے حالات سب سے اچھے ہوجائیں۔ اس وقت بڑی بڑی ٹریلوز ایجنسی ہیں شہر میں ایک تمہارے شوہر کی بھی ہوجائے گی تو کیا ہے اچھا ہی ہے اس میں جو مدد ہوگی ہم لوگ کردیں گے تمہاری۔ اعجاز کے گھر والے بھی دباؤ بنا رہے تھے شادی جلدی کرنے کی، بڑی بہن کے وہاٹس اپ پر میسیج برابر آتا تھا کہ صرف تمہارے لیے رکے ہوئے ہیں نہیں تو اعجاز کے رشتے اور جگہ سے بھی آرہے ہیں، تم لوگ نہایت شریف ہو اس لیے ہم لوگ چاہتے ہیں کہ نسرین ہی کے ساتھ اعجاز کی شادی ہو، اب تو ایک سال سے اوپر ہوگیا ہے بات چیت کرکے اپنا فیصلہ سناؤ۔

الغرض وہ دن بھی آگیا کہ میری شادی اعجاز سے ہوگئی۔ ابو کی زندگی میں ہوئی یہ سب سے بڑی کامیابی تھی میرے بھائی فاضل بھائی کے لیے کیونکہ شادی بیاہ تو وہی کررہے تھے اس لیے میں بھی بیحد خوش تھی، لیکن شادی کے چھ مہینے بعد ہی میرے والد کی طبیعت اچانک بگڑی کہ وہ اس دنیائے فانی کو الوداع کہہ گئے۔ اعجاز کے گھر والوں نے بڑا ساتھ دیا اور اعجاز نے مجھے کچھ دن کے لیے فتح پور ہی میں رہنے کے لیے اجازت دے دی کیونکہ ممی اب اکیلے پڑ گئی تھیں، اب ان کی بھی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ میرا فتح پور آنے جانے کا سلسلہ برقرار رہتا تھا لیکن اعجاز کو پیسے کی زیادہ تمنا نہ تھی وہ کمائی پر زیادہ توجہ نہ دیتے تھے، کہیں مجلس ہوئی تو چلے جارہے ہیں، کہیں محفل ہوئی تو چلے جارہے ہیں، اسی بات پر میری ان سے آئے دن لڑائی ہوتی تھی، میں اُن سے کہتی تھی کہ اپنی زندگی آگے کیسے گزاریئے گا اگر ابھی سے پلان نہ بنایئے گا تو آگے آنے والی زندگی اجیرن ہوجائے گی اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا، ایک حسین وجمیل بیٹا ہوا جس کا نام ایاز رکھا گیا، خیال تو بہت سسرال والوں نے رکھا، بلاقی اڈے پر ایک اچھا نرسنگ ہوم تھا وہیں پر ایاز پیدا ہوا تھا، بہت ہی زیادہ دیکھ بھال کی گئی تھی میری، دو سال بعد اللہ نے ایک بیٹا اور عطا کیا تو سسرال والے بہت خوش ہوئے اور انہوں نے میری بڑی آؤ بھگت کی۔ اس بچے کا نام امان رکھا گیا۔

اسی درمیان میرے جیٹھ کی زوجہ کا جو اکثر بیمار رہتی تھیں انتقال ہوگیا اور اُن کے کوئی اولاد بھی نہیں تھی لہٰذا اُس گھر میں میری قدر اور بڑھ گئی، میرے دونوں بیٹوں کی میرے جیٹھ بڑی قدر اور کیئر کرتے تھے جس سے میں دل ہی دل میں بڑی خوش تھی کہ یہ فیصلہ میری بہنوں نے اچھا کیا سب بہنیں علی گڑھ میں رہتی ہیں اور میں لکھنؤ میں اتنی شان سے لیکن جب سوچتی تھی کہ دودھ منگاتے ہیں ہمارے جیٹھ، اور شوہر دو تین دن بھی بکنگ لے کر گھر سے جاتے ہیں تو صرف فون پر بات ہوتی ہے کچھ کمائی نہیں ہو پاتی ہے، کیسے گھر آگے چلے گا، اسی فکر میں میں گھلی جارہی تھی اور صحت بھی میری خراب ہونے لگی یہ سوچ کر کہ کہیں میرے جیٹھ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو کیا ہوگا؟ حالانکہ میرے جیٹھ اپنی والدہ کے ہاتھ

میں سب کچھ دیے ہوئے تھے اور والدہ بھی میرا بڑا خیال رکھتی تھیں، لیکن کبھی کبھار کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی تھیں جیسے ایک دن گھر میں رنگائی پُتائی کا کام چل رہا تھا، اعجاز بکنگ لے کر گئے ہوئے تھے، جاڑے کا وقت تھا، میں اپنے دونوں بچوں کو چھت پر دھوپ میں لیے بیٹھی تھی کہ کب کھانے کا وقت ہو گیا، اعجاز کی والدہ نے نیچے سے آواز دی کہ بہو ذرا مٹر پلاؤ بنا لو کیونکہ گھر میں کام لگا ہوا ہے کچھ زیادہ نہ بناؤ وہ بھی گھر کے کام میں مشغول تھیں، مجھ سے یہ غلطی ہو گئی کہ امان کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی لہٰذا اُس کو لیے ہوئے میں چھت پر دھوپ میں بیٹھی رہ گئی، نہ میں نے کھانا بنایا اور نہ ہی یہ کہہ سکی کہ نہیں بنا پاؤں گی، کچھ شرم میں حالانکہ بتا دیتی تو اچھا ہوتا، نتیجہ یہ ہوا کہ جب دو بجے سے زیادہ کا وقت ہو گیا تو اعجاز کی والدہ نے کہا کیا ہوا دولہن آئیں نہیں ابھی تم نیچے اور تھوڑی سی خفگی کا اظہار انھوں نے مجھ سے کیا جس سے مجھے تکلیف پہنچی، میرے جیٹھ نے جب سنا تو کہا کوئی بات نہیں، اپنی والدہ سے کہا کہ امی میں بازار سے کھانا لے آتا ہوں، اور یہ کہہ کر انھوں نے ہوٹل سے کھانا لا کر ہم لوگوں کو دیا، اُس دن میں بہت شرمندہ ہوئی کہ کیوں نہ میں مٹر پلاؤ وقت سے بنا پائی۔ انہیں سب باتوں کو لے کر میں بہت غمگین رہتی تھی اور میرے اور اعجاز کے درمیان کی کھائی بڑھنے لگی تھی، ایک دن کی بات ہے کہ اعجاز کی والدہ نے میرے جیٹھ کی شادی یہیں شیش محل حسین آباد میں طے کر دی، لڑکی اچھی تھی کھاتے پیتے گھر کے لوگ تھے، انہوں نے بھی دیکھا کہ لڑکا سرکاری نوکر ہے نہ کوئی انکوائری کی نہ کسی سے پوچھ گچھ کی فوراً سے پیشتر انھوں نے اپنی لڑکی کا ہاتھ میرے جیٹھ کے ہاتھ میں تھما دیا اور اتنی عجلت میں یہ شادی ہوئی کہ میں نے اپنی زندگی میں ایسی شادی اس سے قبل نہیں دیکھی تھی، پھر کیا تھا لڑکی ہوشیار تھی، آتے ہی فوراً اپنے ہاتھ میں سب کچھ لے لیا، اور ایک ایک پائی کا حساب رکھنے لگی، اُس نے تو اعجاز کی والدہ کو بھی کنارے لگا دیا، دودھ کتنا آیا اُس کا حساب ایک پیکٹ میرے لیے رکھتی تھی فرج میں اور کہتی تھی نسرین یہ دودھ تمہارے بھیا کے لیے ہے پکا لینا اپنے حساب سے۔ میں یہ سب سن کر بڑی شرمندہ ہوتی تھی اور سوچتی تھی کہ اگر یہ اعجاز اچھی کمائی کرنے لگیں تو مجھے یہ سب سننا نہ پڑے، کچھ دنوں تک ایسے ہی دن گزرے لیکن ایک دن میری جیٹھانی نے مجھ سے کہا کہ نسرین گوشت میں نے پکا دیا ہے اور روٹیاں تم بنا لینا، میں نے سوچا کہ چلو ہو گا لیکن یہ سلسلہ اب روز کا ہو گیا میری جیٹھانی دال پکا کر رکھ دیتی تھیں اور سبزی وغیرہ اور روٹی کا ٹھیکہ میرے سر پر تھا، میرے جیٹھ جب آفس سے آتے تھے تو میں گرم گرم روٹیاں بنا کر اُن کو دیتی تھی وہ بہت خوش ہوتے تھے اور سب کے سامنے کہتے تھے واہ بھئی واہ نسرین کیا بات ہے تم اتنی اچھی گرم گرم روٹی مجھے کھلاتی ہو اس کا اجر تمہیں پروردگار دے گا، تم ہمیشہ خوش رہوگی، لیکن ان کی دعا مجھے نہ لگی میں آج اتنے غم میں مبتلا ہوں کہ بیان نہیں کر سکتی۔

ہوا یوں کہ کچھ دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن ایک دن میرے جیٹھ اپنی بیوی کے ساتھ ممبئی گھومنے گئے تھے جس پر میں نے اعجاز سے کہا کہ اگر تم بھی ذرا محنت کرو ادھر ادھر کہیں نوکری کر لو تو ہم لوگ بھی کہیں گھومنے چلیں، اس بات کی بھنک اعجاز کی والدہ کو لگ گئی انھوں نے میری اور اعجاز کی کلاس لے لی، اور مجھ سے کہا کہ میرے بیٹے پر دباؤ مت بناؤ،

ہم لوگوں نے پہلے ہی بتا دیا تھا اس کی کمائی کے بارے میں لہٰذا آج کے بعد اس پر پریشر کبھی مت بنانا اسی بات کو لے کر مجھ میں اور میری ساس میں بحث ہوگئی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انھوں نے کہہ دیا کہ جاؤ اعجاز اس کو لے کر تم وہ ابو والے گھر میں چلے جاؤ وہیں رہو جب یہ اکیلے رہے گی تو سمجھ میں آئے گا، میں خوش تو بہت ہوئی لیکن اعجاز نے سب سے پہلے اپنے بھائی کو فون ملایا اور پوچھا کہ کیا حکم ہے نسرین کہہ رہی ہے کہ مجھے اب یہاں ایک پَل بھی نہیں رہنا ہے تو کیا کرائے پر لے جا کر رکھوں، اُدھر سے انہوں نے کہا کہ میں تو ممبئی میں ہوں اگر زیادہ لڑائی جھگڑا ہو گیا ہے تو درگاہ والے گھر پر چلے جاؤ اوپر کا حصہ ابھی خالی بھی ہے نیچے کرایہ دار ہیں تمہارا وہاں پر حساب کتاب بن جائے گا کیونکہ کہیں کرایہ پر رہو گے تو کہاں سے کرایہ دو گے؟ اعجاز مجھے درگاہ والے گھر پر لے گئے جہاں آج بھی میں رہ رہی ہوں۔

درگاہ کے پاس ہی میری پھوپھی بھی رہتی تھیں وہ بھی آجاتی تھیں میرا دل بہل جاتا تھا۔ اعجاز نے پڑوس میں ایک دوکان دار سے بات کر لی تھی جہاں سے راشن ادھار آجاتا تھا، اور جب اعجاز کما کر لاتے تھے تو اُس کو پیمنٹ ہو جاتا تھا، اب اعجاز میں دھیرے دھیرے کاہلی کچھ زیادہ ہی آنے لگی تھی، کوئی بکنگ دور سے کر کے جب آتے تھے تو دن بھر سوتے تھے تب کہیں جا کر ان کی نیند پوری ہوتی تھی، اس طرح سے بزنس بھی چوپٹ ہونے لگا اور آمدنی بھی کم ہونے لگی ادھار زیادہ ہونے لگا، میری بہنوں کو پتہ چلا تو بڑی بہن نے کچھ مدد کرنے کو کہا تو اعجاز نے بالکل منع کر دیا اور کہا کہ کیا میں تمہارے اخراجات پورے نہیں کر رہا ہوں جو تمہارے بہنوئی میرا خرچ چلائیں گے وغیرہ وغیرہ باتیں ہونے لگیں اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ کاش میں نے اپنے والد کا کہنا مان لیا ہوتا تو آج یہ دن مجھے نہ دیکھنا پڑتا کیونکہ انھوں نے اپنی زندگی میں یہاں تک سمجھایا تھا کہ ''ماں باپ اپنے بچوں کے لیے اچھا دیکھتے ہیں ان کی نظر حقیقت پر مبنی ہوتی ہے نہ کہ جذبات پر۔ ماں باپ دور اندیش ہوتے ہیں اُن کو سب کچھ دکھائی دیتا ہے، اور سمجھ میں آتا ہے کیونکہ اُن کے پاس اپنی زندگی کا تجربہ ہوتا ہے، اُسی کا وہ فائدہ اٹھاتے ہیں، اور پھر ماں باپ اپنے بچوں کے لیے اچھا ہی سوچتے ہیں اور اپنے بچوں کی اچھی زندگی کے لیے وہ سخت قدم اٹھاتے ہیں۔

میری تینوں بہنیں جو مجھ سے بڑی ہیں وہ سب آج مجھ سے دیکھنے میں چھوٹی لگتی ہیں کیونکہ وہ عیش و آرام کی زندگی گزار رہی ہیں۔ صرف میرے والدین نے اُن کو سوچ اور سمجھ کر ان کی شادیاں کی تھیں اس بنا پر آج وہ چین سے ہیں اور مجھے انیمیا کی شکایت ہوگئی ہے جس کا علاج چل رہا ہے، آئے دن تو جو اعجاز پیسہ کما کر لاتے ہیں وہ ڈاکٹر ہی کو جاتا ہے بچوں کی تعلیم بھی معمولی سے اسکول میں ہو رہی ہے کہ کسی طرح بچے پڑھ جائیں، کہیں سے کوئی مدد سسرال یا میکہ سے بالکل نہیں ملتی سوائے اللہ کے اور دعا کرتی رہتی ہوں کہ میرے بچے کسی طرح پڑھ جائیں اب یہی میرے لیے سب کچھ ہیں۔ یہ نصیحت ہے اُن لڑکیوں کے لیے جو میری طرح جذبات میں آکر فیصلہ اپنی شادی کا خود سے کرتی ہیں ان کو چاہیے کہ اپنے والدین کا کہنا مانیں نہیں تو میری طرح ہی ان کا بھی انجام اچھا کم اور برا زیادہ ہو سکتا ہے۔

❑❑❑

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی
سابق صدر شعبہ اردو بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی
راجوری (جموں وکشمیر)-M0b.7889952532

ساڑھے آٹھ جُملے

احترام الحیات نے اپنا ناول لکھنے سے پہلے چند اہم باتیں ذہن نشیں کرلی تھیں۔ پہلی بات یہ کہ وہ ایک ایسا ناول لکھے گا جس کا عنوان تجسّس آمیز ہو۔ دوسری بات یہ کہ اُس کا موضوع نہایت اہم اور اچھوتا ہو۔ تیسری بات یہ کہ اُس میں کمال کی فنکاری اور زبان وبیان کی سحر انگیزی ہو۔ چوتھی بات یہ کہ وہ حقیقت وادبیت کا حسین امتزاج ہو۔ ان تمام باتوں کا خیال رکھتے ہوئے اُس نے اپنے ناول کے لئے ایک عنوان ''یہ کہاں آ گئے ہم'' تجویز کیا۔ پورے جوش وجذبے کے ساتھ اُس نے حیات وکائنات کی صداقتوں کو موضوع بناتے ہوئے ناول لکھنا شروع کیا۔ اُس نے مختلف واقعات کی منطقی ترتیب کے تحت پلاٹ سازی، کردار نگاری، ماحول ومنظر نگاری، مکالمہ نگاری اور زبان وبیان پر خاصی محنت کرنے کے بعد تقریباً تین سال میں چار سو اسّی صفحات پہ مشتمل ناول ''یہ کہاں آ گئے ہم'' لکھا۔ اس ناول کو لکھنے کے دوران احترام الحیات نے کافی محنت کی۔ اُس کی تخلیقی حِس نے اُسے اس بات پر خاص دھیان دینے پر مجبور کیا کہ کوئی بھی واقعہ غیر ضروری قرار نہ پائے اور نہ ہی کوئی ایسا جملہ لکھا جائے جو غیر ادبی ہو اور رسوائی کا باعث بنے، کیونکہ اُسے اس بات کا شدید احساس تھا کہ شاعری اور فکشن نگاری کے منفی ومثبت اثرات قارئین کے دل ودماغ میں تادم حیات موجود رہتے ہیں۔ اس لئے اُس نے اپنے ناول ''یہ کہاں آ گئے ہم'' کا مسّودہ تیار کرنے کے بعد اُس کے ایک ایک لفظ پہ بار بار غور وفکر کیا۔ تخلیقی عمل کے دوران جہاں اُس سے زبان وبیان کی غلطیاں رہ گئی تھیں اُنھیں دُرست کیا۔ کرداروں کی آپسی بات چیت کو موثر بنانے کے لئے کچھ جملوں میں حذف واضافہ کیا۔ بار بار فنی لوازمات کے برتاؤ پر دھیان دیا تاکہ کہانی پن میں کسی طرح کا جھول باقی نہ رہے۔ اپنے ناول کو بہت زیادہ معیاری بنانے کے لئے وہ جتنی محنت کرسکتا تھا وہ اُس نے کی۔ جب اُسے اس بات کی تسلّی ہوئی کہ اُس کا لکھا ناول تمام فنی، موضوعاتی اور زبان وبیان کی خوبیوں کے اعتبار سے مکمل ہے تو تب اُس نے یہ چاہا کہ وہ کتابی صورت میں شائع کروانے سے پہلے اپنے ناول ''یہ کہاں آ گئے ہم'' کا مسّودہ ملک کے مشہور ومعروف شاعر، خاکہ نگار، محقق اور فکشن کے نقاد صغیر القمر کے نام وپتے پر اس لئے بھیج دے تاکہ وہ اسے پڑھنے کے بعد ایک بے لاگ اور بصیرت افروز تنقیدی مضمون لکھ کے مسّودہ واپس بھیج دیں۔ احترام الحیات کو دل ہی دل میں یہ خوشی ہورہی تھی کہ صغیر القمر کا تنقیدی مضمون جب اُس کے ناول کے ابتدائی صفحات میں شامل اشاعت رہے گا تو اُس

کے ناول کی عظمت میں اضافہ ہوگا۔اسی خوش فہمی میں اُس نے ایک دن صغیر القمر کو فون کیا۔اُس نے سلام ودُعا کے بعد کہا۔

''جناب میں احترام الحیات عرض کررہا ہوں۔آپ خیریت سے ہیں؟''

صغیر القمر نے فوراً احترام الحیات کی آواز پہچان لی، کہنے لگے۔

''ارے!احترام،کیا حال ہے؟''

احترام الحیات نے جواب دیا۔

''جناب اللہ کے فضل سے خیریت سے ہوں''

صغیر القمر بولے۔

''بھائی آپ کی تحریریں اخبارات ورسائل میں پڑھتا رہتا ہوں۔بہت اچھا لکھتے ہیں آپ،خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ!''

احترام الحیات نے کہا

''جناب یہ سب اللہ تعالیٰ کا مجھ پہ کرم ہے کہ لکھنے پڑھنے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میں نے حال ہی میں اپنا پہلا ناول ''یہ کہاں آ گئے ہم''، مکمل طور پر لکھ لیا ہے۔میرا یہ ناول مسوّدے کی صورت میں چار سو اسّی صفحات پہ مشتمل ہے۔آپ کی خدمت میں آپ کے نام و پتے پر برائے مطالعہ وبصیرت افروز تنقیدی مضمون کی فرمائش کے ساتھ ارسال کرنا چاہتا ہوں۔آپ کی اجازت ہو تو ناول ارسال کردوں؟''

صغیر القمر نے کسی حد تک مسرت آمیز لہجے میں کہا۔

''ارے!کیا بات ہے،آپ کو میری طرف سے بہت بہت مبارک۔پہلی فرصت میں میرے نام و پتے پر اپنا تحریر کردہ ناول بھیج دیجیے۔میں اسے لفظ لفظ پڑھوں گا اور اُس پر لکھوں گا بھی۔''

احترام الحق نے دوسرے ہی دن اچھی طرح اپنے ناول کا مسوّدہ ایک مضبوط لفافے میں ڈال کر اُس پہ صغیر القمر کا نام و پتہ لکھا۔اُس کے بعد جنرل پوسٹ آفس میں آکر ڈھائی سو روپے کی ادائیگی کے بعد اسپیڈ پوسٹ کے ذریعے ناول کا مسوّدہ ارسال کردیا۔پوسٹ آفس والے نے اُسے رسید پکڑائی تو اُس نے پوچھا۔

''بھائی صاحب یہ کب تک پہنچے گا؟''

پوسٹ آفس والے نے جواب دیا۔

''تین دن میں پہنچ جانا چاہیے''

احترام الحیات کو ناول کا مسوّدہ ارسال کرنے کے ایک ہفتہ بعد صغیر القمر کا فون آیا کہ اُنھیں مسودہ موصول ہو چکا ہے۔کوئی ڈیڑھ ماہ گزر جانے کے بعد جب ایک روز احترام الحیات نے صغیر القمر کو فون کیا تو اُنھوں نے کہا۔

''احترام!میرے دوست میں نے دراصل ابھی تک آپ کا ناول پڑھنا شروع نہیں کیا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک عالمی مشاعرے میں شرکت کے لئے جرمنی جارہا ہوں۔وہاں سے واپس آکر ہی میں اسے پڑھنا شروع کروں گا۔آپ اطمینان رکھیں۔''

کوئی تین ماہ گزر جانے کے بعد احترام الحیات نے ایک دن صغیر القمر کو فون پر کہا۔

''جناب مجھے اُمید ہے آپ نے میرا ناول پڑھ لیا ہوگا۔میں آپ کے بصیرت افروز تنقیدی مضمون کے بغیر اسے چھپوانا نہیں چاہتا ہوں۔اس لئے آپ سے میری استدعا ہے کہ جتنا جلدی ہو سکے اپنا مضمون ارسال فرمائیں،نوازش ہوگی۔''

صغیر القمر نے کہا۔

''احترام ! میں معذرت خواہ ہوں ۔میری مصروفیات بہت زیادہ ہیں ۔ان دنوں ایک قومی سیمینار کے لئے تحقیق پر مقالہ لکھ رہا ہوں ۔بس اُس سے فارغ ہوتے ہی آپ کے ناول کو پڑھنا شروع کروں گا اور پڑھنے کے فوراً بعد ایک جامع مضمون لکھ کے آپ کے نام و پتے پر ارسال کر دوں گا۔آپ کی طبیعت اُسے دیکھ کے خوش ہوجائے گی۔''

احترام الحیات نے اطمینان کی سانس لی،اُس نے کہا۔

''جناب آپ کی نوازش، میری سعادت مندی۔ مجھے آپ کے مضمون کا بے تابی سے انتظار رہے گا۔''

چھ ماہ کے بعد جب ایک روز ڈاکیے نے رجسٹرڈ لفافہ احترام الحیات کے ہاتھ میں پکڑانے کے بعد اُس سے ایک الگ کاغذ پہ دستخط کروائے تو وہ بہت خوش ہوا یہ سوچتے ہوئے کہ دیر سے ہی سہی آخر کار میرے ناول ''یہ کہاں آ گئے ہم'' پر صغیر القمر کا مضمون آ ہی گیا۔اُس نے کمرے میں آ کر بڑے شوق کے ساتھ لفافہ چاک کیا۔لفافے کے اندر صغیر القمر نے اپنے لیٹر پیڈ پر احترام الحیات کے ناول پر کُل ساڑھے آٹھ تعریفی جملے لکھے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کے احترام الحیات دیر تک بہت کچھ سوچتا رہا۔اُس کے چہرے سے غم و غصے کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔اب وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ صغیر القمر کے لکھے ان ساڑھے آٹھ جملوں والے کاغذ کو نذرِ آتش کرے یا اپنے ناول کے ابتدائی صفحات میں انھیں شامل کرے۔

❑❑❑

درد فیض خان
لکھنؤ- Mob.8917789319

غزل

جو کوئی اور تیرا ہم سفر ہوگا، غلط ہوگا
بھلے ہی وہ ترا حسن نظر ہوگا، غلط ہوگا

فقط اک آرزو میری تمہارے دل کی دھڑکن ہو
خلاف اس کے عمل کوئی اگر ہوگا، غلط ہوگا

چلے تو آئے ہو تم کفر سے ایمان کی جانب
اگر یہ دل اِدھر سے اب اُدھر ہوگا، غلط ہوگا

ہمارے ساتھ تم دیکھو تعلق روح کا رکھنا
فقط جسموں کا ہی رشتہ اگر ہوگا، غلط ہوگا

چلو اس بار تم انجام سے واقف نہ تھے لیکن
قصورِ عشق گر بارِ دگر ہوگا، غلط ہوگا

کوئی بھی مسئلہ چاہت کا ہو یا گھر کا بٹوارہ
جو کچھ تیغ ستم کی نوک پر ہوگا، غلط ہوگا

وہ اک انساں جو مجھ سے فیضؔ اکثر فیض اٹھاتا ہے
وہی مجھ سے کبھی جو بے خبر ہوگا، غلط ہوگا

●●●

تبصرہ کے لئے کتاب کے دو نسخے بھیجنا لازمی ہے۔

تبصرہ

نام کتاب	:	بیان شبلی (حصہ سوم)
نام مصنف	:	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
ضخامت	:	۲۲۴صفحات
قیمت	:	۳۵۰/روپے
ملنے کے پتے	:	دارالمصنفین ،اعظم گڑھ(یوپی) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دریا گنج، نئی، دہلی
مبصر	:	پروفیسر ثوبان سعید خواجہ معین الدین چشتی لینگوئج یونیورسٹی
موبائل نمبر	:	8299095270

سید سلیمان ندوی مرحوم نے علامہ شبلی نعمانی کے خطبات، خطوط اور مقالات کو یکجا کر کے گیارہ جلدوں میں شائع کرایا تھا، اس کی بدولت جہاں اہل علم کو ایک طرف استاذ وشاگرد کے خوش گوار رشتوں کو سمجھنے کا موقع فراہم ہوا، وہیں حق شاگردی کی ایک صالح روایت بھی قائم ہوسکی۔ سید سلیمان ندوی کے اس کارنامے کی بدولت شبلی شناسی کا ایک دور شروع ہوا اور اس میدان میں نمایاں خدمات سامنے آسکیں۔

سید سلیمان ندوی کے بعد شبلیات میں قدم رکھنے والوں میں سرفہرست ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی ہیں۔ انھوں نے جب سے اس وادی میں قدم رکھا ہے، وہ اس سے باہر نہیں نکل سکے۔ موجودہ وقت میں صورت حال یہ ہے کہ شبلیات یا شبلی شناسی کا لفظ آتے ہی ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی کا نام ذہن میں تازہ ہوجاتا ہے۔ وہ واحد ایسے مصنف اور ادیب ہیں جو برصغیر ہی نہیں بلکہ اردو زبان وادب کی دنیا میں ماہر شبلیات کے نام سے معروف ہیں۔ موصوف نے حیات شبلی کے بیش تر پہلوؤں کو مختلف عنوانات کے ذریعہ متعدد کتب ورسائل میں پیش کیا ہے۔

'بیان شبلی' (حصہ سوم) نو مقالات اور مصنف کے تحریر کردہ ایک دیباچے پر مشتمل ہے۔ دیباچہ پر مغز معلومات کو محیط ہے جو اپنے آپ میں ایک سنجیدہ مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی دیگر تصنیفات و تالیفات: مکتوبات شبلی، مراسلات شبلی، خطبات شبلی، نوادرات شبلی اور افادات شبلی کے علاوہ ''بیان شبلی'' کے دو حصے منظر عام پر آکر مقبولیت ومحبوبیت حاصل کر چکے ہیں۔ ''بیان شبلی حصہ سوم'' اس سلسلہ کی تیسری جلد ہے اور یہ سلسلہ ہنوز تمام نہیں ہوا ہے۔

کتاب کا آغاز ''نوادرات شبلی'' کے عنوان سے ہوتا ہے جو شبلی کی تین نادر تحریریں، ایک نادر خط بنام قاضی عبدالرحمٰن حسرت، دو نادر خطبات، اور ایک نادر تقریر کے علاوہ فارسی کی دو نادر غزلوں پر مشتمل ہے، جو کلیات شبلی میں شامل نہیں ہیں۔

''تین نادر تحریریں'' کے تحت پہلی تحریر ''ایک مبسوط اور مستند سیرت النبی ﷺ'' کے عنوان سے ہے، جس میں علامہ شبلی نے سیرت النبی ﷺ کی ضرورت واہمیت اجاگر کرنے کے علاوہ ان دقتوں اور مشکلات کو پیش کیا ہے جو سپرد قرطاس کرنے کے دوران میں پیش آسکتی ہیں۔

دوسری نادر تحریر بعنوان ''حیات شبلی اور مولانا حالی'' ہے۔ اردو زبان وادب کا کم وبیش ہر طالب علم بخوبی واقف ہے کہ شبلی نے ''حیات جاوید'' کو کتاب المناقب، مدلل مداحی کہا تھا۔ ۱۸۸۶ء میں علامہ شبلی نے کتاب ''حیات سعدی'' پر ایک تبصراتی مضمون لکھا تھا اور حالی کی عظمت کا اعتراف بڑے شاندار اور خوبصورت الفاظ میں کیا تھا، مگر اس کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اسی تبصراتی مضمون کو اس کتاب کی زینت بنایا گیا ہے۔

تیسری نادر تحریر علامہ شبلی کی ایک ایسی سفارشی تحریر ہے جو نظام حیدرآباد سے مالی تعاون حاصل کرنے کی غرض سے محمد عبد القوی فانی کے لیے لکھی گئی تھی۔ اس مقالہ میں مزید دو ایسے نادر خطبات کو بھی شامل کیا گیا ہے جو تحریک ندوہ کی ضرورت وافادیت کو واضح کرتے ہیں۔

دوسرا مقالہ ''بیان شبلی'' کے نام سے موسوم ہے۔ یہ ''تصانیف شبلی'' کے بعض انتخابات کے تعارف کے علاوہ چند قدیم وجدید کتب ورسائل کے ذکر کو محیط ہے۔

تیسرے مقالے کا موضوع ''تصانیف شبلی اور ان کے جوابات'' ہے۔ اس مقالے میں شبلی کے مناظراتی رسالوں یا کتابوں کے ردو جواب میں جو تصانیف تصنیف ہوئیں، ان کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً علامہ شبلی کا ایک مناظراتی رسالہ ''اسکات المعتدی علی انصات المقتدی'' ہے۔ علامہ شبلی نے خلف الامام قرآن کی تلاوت کو واجب نہیں بلکہ مکروہ قرار دیا ہے۔ اس کی دلیل میں قرآن کی یہ آیت پیش کرتے ہیں ''اذا قری القرآن فاستمعوا'' مذکورہ رسالے کے جواب میں پانچ کتابیں لکھی گئیں۔ اسی طرح سیرت النبی ﷺ حصہ اول، دوم کے جواب میں چھ کتابیں تحریر کی گئیں، علاوہ ازیں شبلی کی مزید سات ایسی کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے جس کے جوابات حریفانِ شبلی نے لکھے۔ ایسی تحریروں کی مجموعی تعداد ۲۷ ہے۔ کتاب کا یہ حصہ اردو ادب خصوصاً شبلی کے قدر دانوں کے لیے کافی مفید وکارآمد ہے۔

چوتھا مقالہ ''اثرات شبلی'' ہے۔ دیباچے میں ڈاکٹر صاحب نے اس مقالہ کو اپنی دوجلدی تصنیف ''اثرات شبلی'' کی توسیع قرار دیا ہے۔ یہ حصہ متاثرین شبلی کے تعارف کے علاوہ ان کے اقتباسات پر مبنی ہے، جن میں پنڈت منوہر لال زتشی، مشفق خواجہ اور میجر شمس الدین محمد کے علاوہ چھ مزید شخصیات کا بیان ہے۔ میجر شمس الدین محمد ریاست بہاول سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے علامہ کی درخواست پر ندوہ کو پچاس ہزار روپے عنایت کیے تھے جو اس وقت کے لحاظ سے بہت بڑی رقم تھی۔ اس رقم نے ندوہ کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

پانچواں مقالہ تحریک ندوہ میں ''علامہ شبلی کے سوا اعظم گڑھ'' کے عنوان سے ہے۔ ندوہ اور شبلی ایک ایسا موضوع ہے جو شبلی سے دلچسپی رکھنے والے ہر خاص وعام کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ شبلی اور ندوہ کے مابین تعلقات ووابستگی کی داستان میں ایک خاص قسم کی حیرت ناکی اور رومانیت بلاشبہ موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس تعلق سے اعظم گڑھ کی ان شخصیات کا ذکر کیا ہے جنھوں نے شبلی سے

تعلقات کی بنا پر ندوہ کی ترقی میں اہم رول ادا کیا تھا۔ اسی طرح چھٹا مقالہ ''برادارانِ شبلی'' کے عنوان سے قلم بند کیا گیا ہے۔ اس مقالہ کے تعلق سے ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ ابھی تک خانوادہ شبلی پر سرے سے کام نہیں کیا گیا ہے۔ موصوف کو نہایت تلاش وتفحص سے برادران شبلی: مہدی حسن بیرسٹر، محمد اسحاق وکیل، اور محمد جنید نعمانی سب جج کی شخصیات کو پیش کرنے کا شرف حاصل ہے۔ شبلی کے علاوہ برادران شبلی نے بھی ضلع اعظم گڑھ میں علم کی شمع روشن ہی نہیں کی بلکہ اس روشنی کو ملک کے کونے کونے تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ دونوں مقالے شبلیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایسی معلومات کا خزانہ ہیں جو شبلی پر لکھی گئی دیگر تحریروں میں غالباً مفقود ہے۔

ساتواں مقالہ بعنوان ''ایک عاشق شبلی: قاضی عبدالرحمٰن حسرت'' ہے۔ اس مقالے میں قاضی عبدالرحمٰن حسرت کی شخصیت اور کی تخلیقات کا ایک ایسا مرقع کھینچا گیا ہے جو شبلی اور دبستان شبلی سے حسرت کی قلبی وابستگی کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

آٹھواں مقالہ ''مسافرانِ شبلی منزل'' ہے۔ شبلی منزل دراصل دارالمصنفین ہے۔ علمی اور تحقیقی خدمات کی بنیاد پر برصغیر میں ایک ادارے کی حیثیت سے معروف ہے۔ عہد شبلی سے دورِ حاضر تک اس ادارے سے جملہ مذہب وملت کے افراد کی اس سے خاص انسیت رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب پہلے محقق ہیں جنھوں نے زائرین دارالمصنفین کو اپنا موضوع بنا کر بیش قیمت مقالہ تحریر کیا۔ بلاشبہ یہ ایک دلچسپ کوشش ہے۔ یہ مقالہ محض ان مسافرانِ شبلی منزل تک محدود ہے جنھوں نے عہد شبلی وسلیمان میں اس ادارے کی کوچہ گردی کی تھی۔ ان مسافرین وزائرین میں نواب محسن الملک، مولانا عبدالحی حسنی، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت مدن موہن مالویہ، پنڈت موتی لال نہرو، مہاتما گاندھی اور ہندوستان کے اولین وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے علاوہ مزید ۲۳ مایۂ ناز شخصیات کی شبلی کے تئیں عقیدت ووابستگی کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ حصہ معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی بہت ہے۔

نواں مقالہ ''سخنورانِ شبلی'' کے عنوان سے ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی تصنیف ''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' کے اضافات کے طور پر ہے۔ اس میں اردو، عربی اور فارسی کے ان شعرا کا ذکر ہے جنھوں نے علامہ شبلی کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کی مجموعی تعداد اٹھارہ ہے۔ مذکورہ نو مقالات کے علاوہ ایک طویل فہرست کتب ورسائل پر مبنی کتابیات اور مولانا محمد عرفات اعجاز اعظمی کا مرتب کردہ چھ صفحات پر مشتمل اشاریہ ہے۔ اخیر میں شائستہ ریاض کا تحریر کردہ تعارف مصنف بعنوان ''سوانحی کوائف مع تصنیفات وتالیفات'' پر مشتمل ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں مختلف مقالات کے تحت جن نکات پر گفتگو کی گئی ہے، وہ بہت جامع ہیں، نیز ایسی معلومات پر مبنی ہیں، جو ضخیم سے ضخیم تر تصنیفات ورسائل کی ورق گردانی پر بمشکل مل سکیں گی۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ تصنیف سابقہ تصانیف کی طرح ہی کامیاب اور قابل داد ہے۔ اللہ رب العزت موصوف کو صحت وتندرستی کے ساتھ اپنی امان میں رکھے تا کہ وہ شبلی شناسی اور شبلی فہمی کے نئے نئے گوشوں کو سنجیدہ قارئین اور نئی نسل تک پہنچانے کا کارنامہ انجام دیتے رہیں۔

❑❑❑

اتر پردیش اردو اکادمی میں ریسرچ اسکالرس کا سمینار

تحقیق میں بہت تحمل، دل جمعی اور محنت شاقہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ

اتر پردیش اردو اکادمی نے ایک نئی روایت کا آغاز کرتے ہوئے صوبے کی مختلف یونیورسٹیز کے ریسرچ اسکالرس کا سمینار ۷؍مارچ ۲۰۲۴ء کو اردو اکادمی آڈیٹوریم، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر لکھنؤ میں منعقد کیا۔ ریسرچ اسکالرس نے اپنے تحقیق کے موضوع پر ہی مقالے پیش کئے۔ سیمینار کی صدارت پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ تحقیق بہت ہی تحمل اور دل جمعی کا کام ہے۔ تحقیق کے میدان سے تن آسانی کے ساتھ نہیں گزرا جا سکتا، اس میں محنت شاقہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر شہاب الدین ثاقبؔ نے اپنے خطاب میں پیش کئے گئے مقالات کا جائزہ لیا اور کہا کہ ریسرچ اسکالرس کا مقالہ معروضی ہونا چاہیے اور مقالہ کی زبان میں تشبیہ اور استعارے کا استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ مقالہ میں غیر ضروری اقتباسات سے بچنا چاہیے۔ بلکہ اپنا واضح نقطۂ نظر پیش کرنا چاہیے۔ مہمان ذی وقار کے طور پر ڈاکٹر صبیحہ انور نے شرکت کی۔ اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ تحقیق لفظ حق سے نکلا ہے یا حقیقت سے نکلا ہے لہٰذا، مقالہ میں حقیقت بیانی سے کام لیا جانا چاہیے۔ تحقیق نہ خشک ہونی چاہیے اور نہ بہت ہی رنگین۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر عاصم رضوی نے بھی اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ تحقیق تربیت کا مرحلہ ہے۔ لہٰذا ایک ریسرچ اسکالر کو موضوع سے وابستہ رہتے ہوئے اس کے جواز اور اس کی معنویت پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔

اس موقع پر سکریٹری اکادمی ایس۔ ایم عادل حسن نے بھی خطاب کیا۔ جبکہ نظامت کے فرائض پروفیسر ریشما پروین، صدر شعبۂ اردو، کھن کھن جی پی۔ جی کالج نے انجام دئے۔

لکھنؤ یونیورسٹی سے سنبل صبیحہ نے سماجی حسیت کا علمبردار غضنفر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس سے تیمور احمد خاں نے آزادی کے بعد جدید اردو نظم میں زبان کا تخلیقی استعمال اور فرح جبیں نے جدید افسانوں میں صنعتی ترقی کے منفی اثرات، دین دیال اپادھیائے گورکھپور یونیورسٹی سے زین العابدین نے اتر پردیش میں نعت گوئی کی روایت، خواجہ معین الدین چشتی لسانیات یونیورسٹی، لکھنؤ سے محمد فیض صدیقی نے ”ملک زادہ منظور احمد: ادیب و ناقد، الہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج سے اسنیٰ سحر نے اردو میں انشائیہ نگاری کی روایت (رشید احمد صدیقی سے مجتبیٰ حسین تک) اور نہاں نے اختر الایمان کی نظم نگاری کا فکری وفنی مطالعہ، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ سے شاہ زمن نے شمیم حنفی بحیثیت محقق و ناقد ایک مطالعہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے طاہر حسین نے شمیم حنفی کی ادبی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ اور صابر ریاض نے خواجہ ناصر نذیر فراقؔ دہلوی کی علمی وادبی خدمات کا تنقیدی مطالعہ، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی سے مریم صبا نے رام نرائن اگر وال کی خدمات اور محمد عامر نے تقسیم ہند کا المیہ اور اردو انگریزی ناول ایک تقابلی مطالعہ“ کے موضوع پر مقالے پیش کئے۔

آخر میں سپرنٹنڈنٹ اکادمی محمد معاذ اختر احسن نے مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

❑❑❑

حمیدیہ گرلز ڈگری کالج میں اردو اکادمی کے تعاون سے ثقافتی جلسہ ’آہنگ‘ کا انعقاد
سکریٹری اردو اکادمی بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے

اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ کے زیر تعاون حمیدیہ گرلز ڈگری کالج پریاگ راج کے بیگم خورشید خواجہ ہال میں ۲۹؍فروری ۲۰۲۴ء کو سالانہ ثقافتی جلسہ ’آہنگ‘ کا انعقاد کیا گیا جس کی ابتدا سبھی مذاہب کی دعاؤں ’سرودھرم پرارتھنا‘ کی شکل میں مہمانوں کا خیر مقدم مومنٹو اور نذرانۂ گل پیش کرتے ہوئے کیا گیا۔ کالج پرنسپل پروفیسر ناصحہ عثمانی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کالج کا مختصر تعارف پیش کیا۔ مہمان خصوصی جناب ایس۔ ایم۔ عادل حسن، سکریٹری، یو پی اردو اکادمی، لکھنؤ نے پروگرام کی مبارکباد دیتے ہوئے تعلیم کو ضروری بتایا۔ انہوں نے حمیدیہ گرلز ڈگری کالج کے تعاون سے اردو اکادمی میں اس طرح کے ثقافتی پروگرام کے منعقد کرانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اعزازی مہمان پروفیسر شبنم حمید، صدر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، نے پروگرام کی مبارکباد دیتے ہوئے کلچرل پروگرام کی معنویت بتائی نیز سیکھنے کے لیے مطالعہ سے زیادہ مشاہدہ کو ضروری بتایا۔ پروگرام سے محظوظ ہوتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس پروگرام میں آہنگ کے ساتھ اُمنگ بھی ہے۔

اس موقع پر غالبؔ، میرؔ، اقبالؔ اور میری ماٹی میرا دیش کے تحت بعنوان ’اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے‘ پر مشتمل نمائش خطاطی کا افتتاح مہمان خصوصی کے دست مبارک سے کیا گیا۔ اردو کتابت کے استاد محترم جناب نصر اللہ صاحب کو ۲۰۰۷ء سے اب تک طالبات کو اردو کتابت کی بہترین درس و تدریس اور ان کی بہترین خدمات کے لیے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ ڈاکٹر زرینہ بیگم، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج پریاگ راج و کوآرڈینیٹر اردو کتابت نے اردو کتابت سنٹر کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے کالج میں اردو کتابت کی طالبات کے ذریعہ تیار کردہ نمونۂ کتابت کے ۳ البم جناب ایس۔ ایم۔ عادل حسن، سکریٹری، یو پی اردو اکادمی، لکھنؤ کی خدمت میں پیش کیے۔ محترمہ نیرجا ورما، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ انگریزی، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج پریاگ راج کی زیر نگرانی طالبات نے ایک ڈراما بعنوان ’انتظار‘ پیش کیا اور ڈاکٹر نسرین بیگم، شعبۂ قدیم تاریخ و ڈاکٹر زرینہ بیگم، شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، پریاگ راج کی زیر نگرانی طالبات نے گنگا جمنی تمثیلی مشاعرہ میں اکبر الہ آبادی، فراق گورکھپوری، راز الہ آبادی، عتیق الہ آبادی، شبینہ ادیب، نرالا، مہادیوی ورما، کمار وشواس، دشینت کمار، ہری ونش رائے بچّن کے روپ میں ان کا کلام پیش کیا۔ ایم۔اے۔ شعبۂ سماجیات کی طالبہ شرمسار فاطمہ نے اپنی شیریں آواز میں غزل اور کامیڈی پیش کی۔ اس موقع پر سیشن ۲۰۲۳ء۔۲۰۲۲ء میں کالج میں اوّل مقام حاصل کرنے والی طالبہ عائشہ شمیم، بی۔اے۔ سال سوم کو شیروانی میموریل گولڈ میڈل، ادیبہ شکیل، بی۔کام سال سوم کو کنیز زہرا میموریل گولڈ میڈل، میانشی سنگھ، بی۔واک۔ (جرنلزم اینڈ ماس کمیونیکیشن) سال سوم کو مسرت فاطمہ میموریل گولڈ میڈل، حرا احمد، بی۔اے۔ سال سوم کی شعبۂ انگریزی کی ٹاپر کو قدسیہ بیگم میموریل گولڈ میڈل، چاندنی، بی۔اے۔ سال سوم کی شعبۂ تاریخ کی ٹاپر کو پروفیسر چندرا پنت میموریل گولڈ میڈل، الکاریہ نفیس صدیقی، بی۔اے۔ سال سوم کی شعبۂ جغرافیہ کی ٹاپر کو قطب جہاں میموریل گولڈ میڈل، وینا کماری، ایم۔اے۔ شعبۂ تاریخ کو عالیہ بیگم میموریل گولڈ میڈل، ثنا انصاری۔ ایم۔اے۔ اردو کو عابدہ خاتون میموریل گولڈ میڈل سے سرفراز کیا گیا۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض شعبۂ انگریزی کی طالبات مریم حیدری اور عظمیٰ خان اور رسم تشکر محترمہ نیرجا ورما، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ انگریزی، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج پریاگ راج نے ادا کی۔

❑❑❑

اردو اکادمی میں ۷؍مارچ ۲۰۲۴ء کو منعقدہ ریسرچ اسکالرس سیمینار میں شرکت کرنے والے مقالہ نگار

U.P. Urdu Akademi

Khabarnama

उ.प्र. उर्दू अकादमी ख़बरनामा

اُتر پردیش اُردو اکادمی خبرنامہ

Vol. No. 52 | April 2024 | Issue No. 10

ریسرچ اسکالرس سیمینار میں (دائیں سے) پروفیسر شہاب الدین ثاقبؔ، ڈاکٹر صبیحہ انور، پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ،
ایس۔ مناظر عادل حسن سکریٹری اردو اکادمی اور ڈاکٹر ریشماں پروین کے ساتھ ریسرچ اسکالرس

ریسرچ اسکالرس سیمینار منعقدہ ۷؍مارچ ۲۰۲۴ء میں ہمہ تن گوش سامعین کا منظر